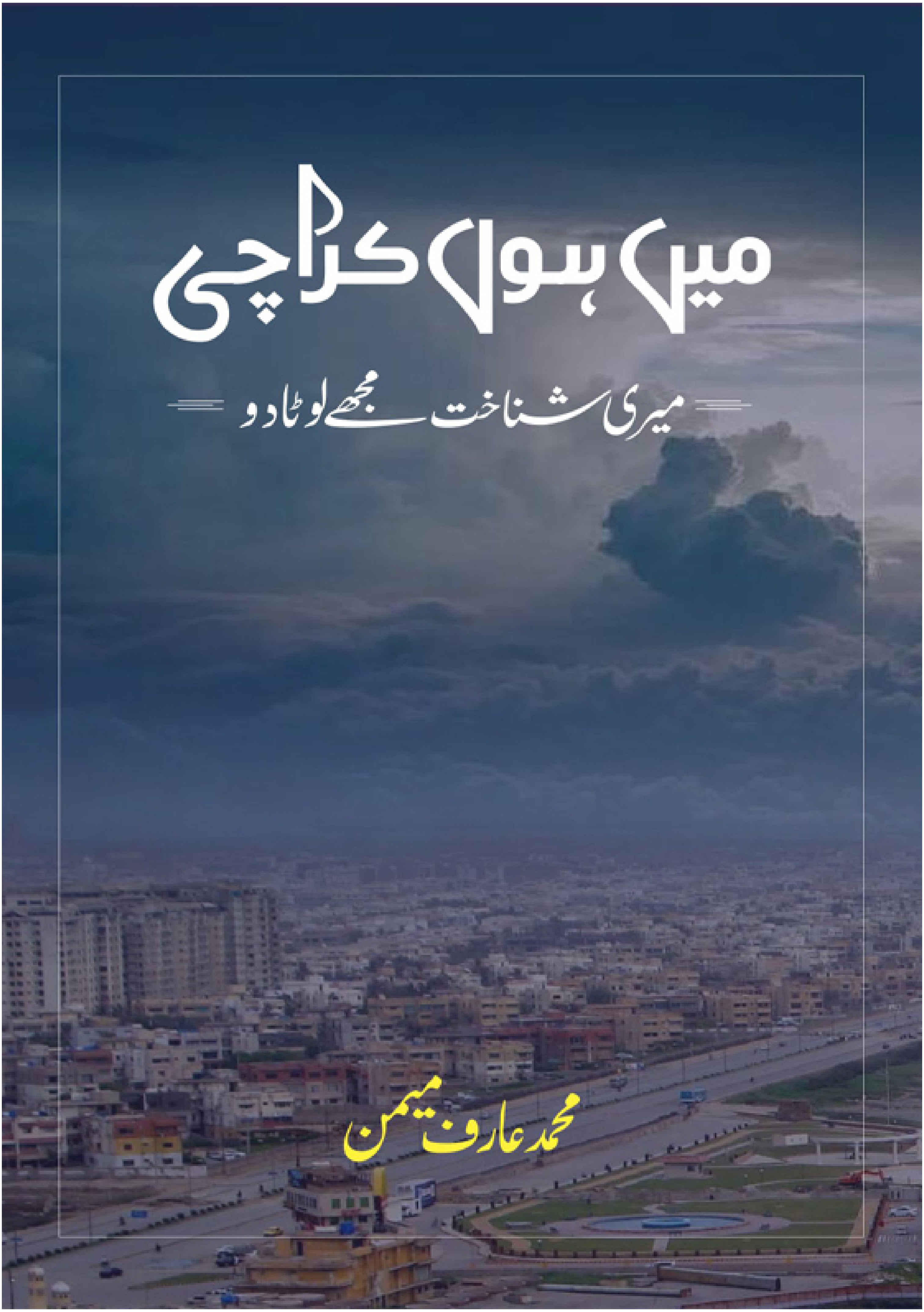

میں ہوں کراچی

میری شناخت مجھے لوٹا دو

محمد عارف میمن

میں ہوں کراچی

میری شناخت مجھے لوٹا دو

محمد عارف میمن

رائٹرز کلب پاکستان

کتاب کے جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب..........................**میں ہوں کراچی**

ایڈیشن..............................اول

سن اشاعت........................2021ء

تعداد.................................500

صفحات..............................200

قیمت.................................200

پبلشر...................رائٹرز کلب پاکستان

رابطہ نمبر

0345-3175242 / 0312-5491079

memon97@gmail.com

www.writersclubpakistan.com

www.mytime.com.pk

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
	ادارے کا تعارف	
	تاثرات، ہدایات	
01	کراچی، عالمی شہر یا کچرا گھر؟	9
02	میں کراچی ہوں	12
03	کراچی سرکلر ریلوے، دیوانے کا خواب	15
04	ریاست مدینہ میں مجبور باپ کی خودکشی	20
05	معاشی ترقی یا غریب کی موت	24
06	عوامی حکومت یا ہماری حکومت؟	28
07	پانچ روپے کلو والی مٹر اور سفید پوشوں کی عزت	32
08	سرکاری مال مفت کا ہے؟	36
09	سیاسی ڈرامے بازیاں	40
10	ظلم کی ریاست؟	44
11	فرحان کی موت کا ذمے دار کون؟	48
12	کراچی، پانی بحران سے انتخابی منشور بھی پانی پانی	52
13	پاکستان میں قانون کی حکمرانی: دیوانے کا خواب	55
14	حکومت کے منہ پر طمانچہ، ننھی سکینہ کی شہادت	59
15	ہمارے محافظ بھی ہمارے نہیں رہے!	62
16	کراچی میں لاقانونیت کا راج	68

17	کراچی کا کچرا اور ہماری ذمے داری	72
18	80 لاکھ سے زائد پاکستانی منشیات کے عادی	76
19	عوام اور ٹیکس	81
	بلدیہ ٹاؤن یا کچرا گھر	89
	پی ایس ایل اور صوبائی اداروں کی منافقت	93
	کراچی پولیس کی پیشہ ورانہ اور اخلاقی تربیت ناگزیر	96
	ہمارا حکمران چور ہے؟	100
	30 سال پہلے والے کراچی کیلیے 30 سال پرانا ماحول	104
	زینب: ہم شرمندہ ہیں	107
	پولیو اور سوشل میڈیا کا غلط استعمال	110
	نیا سال اور نوجوان نسل	113

مسائل کے انبار سے اِک صدائے احتجاج

دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک شہر، کراچی ... جس کی آبادی 98 ملکوں سے زیادہ ہے لیکن جسے آج تک نوآبادیاتی نظام کے تحت، کسی چھوٹے سے قصبے کی طرح چلایا جارہا ہے۔ پاکستان کا شاید ہی کوئی مقام، کوئی علاقہ ایسا ہو کہ جس کا باسی یہاں آباد نہ ہو۔ جتنی متنوع فیہ اور کثیر آبادی، مسائل بھی قدرتی طور پر اتنے ہی زیادہ، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ کراچی کے مسائل اور اس شہر کے ساتھ مسلسل ہونے والی حق تلفیوں پر موثر آواز اٹھانے والا کوئی نہیں۔ جنہیں اس شہر کے 80 فیصد مینڈیٹ کا دعویٰ ہے، وہ ہر معاملے میں بھاری نقدی وصول کر کے مجرمانہ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ دوسری طرف وہ بےنوا ہیں کہ جن کی صدائے احتجاج محض ان کی غیر مقبول سیاسی وابستگی اور "مذہبی سیاسی لیبل" کی بدولت، بہری سماعتوں کی نذر ہو جاتی ہے۔

سچ کہوں تو کراچی کے مسائل اتنے زیادہ اور متنوع ہونے کے باوجود، ایک دوسرے سے اس قدر مربوط (integrated) ہیں کہ کسی بھی ایک مسئلے کو دیگر مسائل سے یکسر الگ کر کے، مکمل جداگانہ طور پر حل نہیں کیا جا سکتا۔ کاش کہ اس ملک کے ظاہری اور "حقیقی مالکان" کراچی شہر کے مسائل کو درست تناظر میں، درست نقطۂ نگاہ سے سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش بھی کریں۔ زیرِ نظر کتاب "میں ہوں کراچی" اسی سمت میں ایک صحافتی کاوش ہے جو نوجوان صحافی و قلمکار، عارف میمن نے کی ہے۔

ہر چند کہ اس کتاب میں شامل بیشتر تحریریں بلاگز پر مبنی ہیں جو وقتاً فوقتاً، کراچی کے مسائل کو اجاگر کرنے کیلئے لکھے گئے ہیں، لیکن بہرحال وہ اپنی اپنی جگہ حل طلب ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کیلئے میں "رائٹرز کلب پاکستان" کو خصوصی مبارکباد دینا چاہوں گا کہ وہ کتب نویسی کے میدان میں نئے نام متعارف کروانے کیلئے اپنی کوششوں کا سلسلہ 2018ء سے جاری رکھے ہوئے ہیں... وہ بھی ایسے

حالات میں کہ جب "سماجی رابطوں" (سوشل میڈیا) کی بڑھتی ہوئی مقبولیت نے ایک عام قاری کی قوتِ مطالعہ اس حد تک کم کردی ہے کہ وہ سو دو سو الفاظ پر مبنی تحریر پڑھ کر ہی تھکنے لگتا ہے۔

ویسے تو اس کتاب میں کراچی کے مسائل کو بخوبی اجاگر کیا گیا ہے لیکن ویب سائٹ کیلئے بلاگ نگاری کا معاملہ، اخبار کیلئے کالم نگاری سے عملاً کچھ مختلف نہیں ہوتا۔ مطلب یہ کہ اکثر کالموں کی طرح بلاگز بھی ایک مخصوص وقت اور کچھ مخصوص حالات کے مطابق ہوتے ہیں۔ مشورتاً کہنا چاہوں گا کہ سب سے پہلے تو ہر باب کے اختتام پر متعلقہ بلاگ کا یو آر ایل (URL) اور تاریخ اشاعت ضرور دے دیئے جائیں تا کہ سند رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کتاب کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کیلئے کم و بیش ہر بلاگ کو (مصنف کی جانب سے) کچھ اس طرح تبدیل کیے جانے کی ضرورت ہے کہ وہ "وقتی" نہ رہے بلکہ کسی حد تک ایک جامع صورت اختیار کر جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ کتاب کی افادیت اور اثر پذیری، دونوں ہی وسیع تر ہو جائیں گی؛ اور یہ کتاب آنے والی نسلوں کیلئے بھی مفید تر رہے گی۔ علاوہ ازیں، کسی بھی کتاب میں مضامین و عنوانات کی موضوعاتی ترتیب بھی قارئین کو باندھے رکھنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر یہ بھی ہو جائے تو کیا کہنے!

اختتام پر صرف اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ عارف میاں ایک اچھے اور معیاری قلمکار ہیں۔ امید ہے کہ وہ خوب سے خوب تر کی جستجو کرتے رہیں اور اپنی قلموں کاوشوں کو نکھارتے رہیں گے۔

ایک بار پھر، رائٹرز کلب اور عارف میاں (عارف میمن، زیرِ نظر کتاب کے مصنف) کیلئے نیک تمنائیں اور ڈھیروں دعائیں۔

آپ کا،

علیم احمد

کراچی، عالمی شہر یا کچرا گھر؟

میئر کراچی وسیم اختر نے جس دن اپنے عہدے کا چارج سنبھالا اُس دن سے ہم صرف ایک ہی بات سنتے آرہے ہیں کہ 'ہمیں اختیارات دیے جائیں'۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جن اختیارات کی بات میئر صاحب کررہے ہیں، اُن سے عوام کو کچھ لینا دینا نہیں۔ عوام تو صرف یہ چاہتی ہے کہ اُن کے مسائل کا سدباب کیا جائے، اُنہیں ریلیف دیا جائے، اُن کے گھر کے باہر اور پارکوں و میدانوں میں موجود گندگی کے ڈھیر ختم کیے جائیں، سیوریج کا نظام بہتر کیا جائے اور پینے کا صاف پانی مہیا کیا جائے۔ ہم نا جانے کیوں ہر بار اپنی عوام کو بھولی اور بیوقوف سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ بات ٹھیک نہیں، کیونکہ عوام یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ بلدیاتی نمائندوں سے وہ جو مطالبات کررہے ہیں اُن کو پورا کرنے کا اختیار تو یوسی چیئرمین کو بھی حاصل ہیں، لیکن نا جانے پھر میئر صاحب کن اختیارات کی بات کررہے ہیں جو انہیں ان کاموں سے روک رہے ہیں۔

یہاں اہم ترین بات یہ ہے کہ اگر مان لیا جائے کہ میئر صاحب کے پاس عوام کے بنیادی مسائل حل کرنے کے اختیارات بھی نہیں تو پھر وہ کس بنیاد پر عہدے پر تا حال براجمان ہیں؟ یہ عوام کا حق ہے کہ وہ ان سے اس بارے میں سوال کریں اور میئر صاحب کا فرض ہے کہ وہ ان سوالوں کا سیدھا اور سمجھ آنے والا جواب دیں۔

بلدیہ ٹاؤن، اورنگی ٹاؤن، سائٹ، لیاری، کیماڑی، کورنگی، لانڈھی سمیت شہر کے ہر علاقے میں گندگی کے ڈھیر ہر جانب نظر آرہے ہیں۔ میئر کا 100 دن میں کچرا ختم کرنے کا وعدہ بھی 'اُن اختیارات' کی زد میں آکر وفا ہونے سے رہ گیا۔ مون سون کی بارشیں ہر سال ہوتی ہیں اور اس کے پیش نظر اقدامات میں غفلت انتہائی افسوس ناک عمل ہے۔

کراچی ایک ایسی سونے کی چڑیا ہے جس کے نام پر اربوں روپے لیے جاتے ہیں، تاہم بدلے میں صرف چند سکے ہیں جو اس بدنصیب شہر کے حصے میں آتے ہیں۔ کراچی کے لیے جو بجٹ مختص کیا جاتا ہے وہ کہاں استعمال ہوتا ہے یہ جاننا عوام کا حق ہے۔ نالوں کی صفائی اور حفاظتی اقدامات کے معاملے پر ہر سال شور اُٹھتا ہے، بجٹ مختص ہوتے ہیں، متعلقہ اداروں تک رقم پہنچتی ہے مگر حاصل حصول کچھ نہیں ہوتا۔ بارشیں تباہی مچا کر چلی جاتی ہیں اور نالوں کی صفائی اور حفاظتی انتظامات کے نام پر لیے جانے والے فنڈز کہاں جاتے ہیں کچھ خبر نہیں۔

عوام بارشوں میں سڑکوں پر ماری ماری پھرتی ہیں اور سندھ اور کراچی کے کرتا دھرتا سوٹ بوٹ پہن کر مہنگی گاڑیوں میں بارش کو انجوائے کرتے نظر آرہے ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ بھی ایک عرصے سے چلا آرہا ہے۔ کراچی کو پاکستان کی ماں کا

درجہ حاصل ہے مگر اب اِس ماں کی گود اُجڑ چکی ہے، کیونکہ اِس کے بیٹوں نے اِسے کہیں کا نہیں چھوڑا ۔اِس ماں نے اپنے حصے کی روٹی تک اپنے بیٹوں میں تقسیم کردی مگر یہی بیٹے آج بھی اِسی کے نام پر کھا کر اِسی کو دنیا میں بدنام کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

اگر بات کی جائے بلدیہ ٹاؤن کی تو اِس وقت یہ علاقہ ایک ڈسٹ بن نظر آتا ہے، جہاں جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر انتظامیہ کا منہ چڑا رہے ہیں، وہیں سڑکوں کا کہیں نام ونشان تک نہیں رہا۔اب سڑکوں کی جگہ گڑھوں نے لے لی ہے۔یہاں گزشتہ چار پانچ سال سے پینے کا پانی میسر نہیں ،لائنیں خشک ہوکر بند ہو چکی ہیں، ٹینکر مافیا اور جگہ جگہ غیر قانونی ہائیڈرنٹس سرکاری سرپرستی میں چل رہے ہیں۔بیماریاں ان گنت پھیل چکی ہیں مگر کہیں بھی کوئی سرکاری ڈسپنسری موجود نہیں۔عطائی اور نجی کلینک عوام کا خون چوسنے میں مصروف ہیں۔

اِس شہرِ قائد میں صرف ایک چیز پوری ایمانداری سے کی جاتی ہے اور وہ ہے سیٹ کے لیے لڑائی۔باقی مسائل کے لیے صرف اجلاس ہی اجلاس منعقد ہوتے ہیں جن میں اعلیٰ طعام اور انتخابات میں سیٹوں کی ایڈجسٹمنٹ کے سوا کوئی بات بھی قابلِ ذکر نہیں ہوتی۔

میری کراچی کے کرتا دھرتاؤں سے صرف اتنی سی گزارش ہے کہ وہ اس شہر کو مزید تباہی کی جانب نہ دھکیلیں اور اپنی سیاست کو چمکانے کے ساتھ ساتھ کچھ عوامی بھلائی کے کام بھی کرلیں۔ہم اور آپ اپنا وقت پورا کرکے چلے جائیں گے مگر ہماری نسلیں ہمیں قبر تک بددعائیں دیتی رہیں گی۔ہمیں اس مٹی پاکستان کو پھر سے گلدستہ بنانا ہے نہ کہ سیاسی اکھاڑا، جہاں صرف اور صرف اپنے اپنے مفادات کی جنگ لڑی جاتی ہے۔

میں کراچی ہوں

تہذیبوں کے اس سفر میں آج میری شناخت مکمل طور پر گم ہو کر رہ گئی ہے۔521 قبل مسیح کے یونانی سیاح اسکائی لیکس ہندوستان کے حالات دیکھنے کی غرض سے گسری بندر سے سندھ پہنچا جس نے پہلی ہی نظر میں مجھے پسند کیا اور میری تعریف میں قصیدے لکھ دیے۔پھر 326 قبل مسیح میں سکندر اعظم اپنے لشکر سمیت مجھ پر وارد ہوا۔مجھے یاد ہے جب سکندر کے ایک جرنیل نیارکس نے میرا امن، سبزہ اور خوش حالی دیکھی تو کہا یہ میرے آقا سکندر کی جنت ہے۔مجھ پر قبضہ کرنے کے بعد میں نے کئی یونانیوں کو اپنے سینے میں پناہ دی۔یونانیوں سے قبل مجھ پر فارس والوں کا بھی ہاتھ رہا۔برہمن دور میں میرے آس پاس کئی زرعی گاؤں دیہات آباد تھے جہاں مندروں سے ہر وقت گھنٹیوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔یہ سلسلہ کئی صدیوں تک چلا، پھر 711ء میں عربوں نے مجھے اپنے قبضے میں لے لیا اور اس کے بعد ایک اور نئی تہذیب کی شروعات ہوئی جہاں ہر وقت اللہ اکبر کی صداؤں سے میں ہر وقت خوش رہنے لگا۔

1723ء میں سیٹھ بوجول نامی ایک کاروباری شخص گھومتا گھامتا مجھ تک آن پہنچا۔میری خوش حالی اور امن پسندی کو دیکھ کر اس نے مجھے اور میں نے اسے اپنا لیا۔اس شخص نے یہاں کاروبار شروع کیا، میری موجودہ ترقی کی اصل وجہ یہی شخص تھا۔یہ میرا محسن تھا کیوں کہ اس نے میرے بچوں کو روٹی کا ذریعہ دیا۔کبھی میں چھوٹے چھوٹے گاؤں دیہاتوں میں بٹا ہوا تھا لیکن آج میں میگا سٹی بن چکا ہوں۔میرا شمار دنیا کے سات بڑے شہروں میں ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود آج میں بہت دکھی ہوں۔سوچتا ہوں وہ دور بہت اچھا تھا جب میں ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹا ہوا تھا، لیکن آج میرے بچے بٹے ہوئے ہیں۔مجھے اپنانے اور ترقی دینے کے نام پر آگ اور خون میں نہلایا گیا، مجھے ماں کا درجہ دینے والے ہی میرے قاتل نکلے۔مجھے میرے بچوں نے ہی بربادی کے اس دہانے پر پہنچا دیا جہاں آج ہر طرف نفرت، افراتفری، لسانی گروہ بندی، قتل و غارت گری کا راج ہے۔اتنا درد اور اتنی تکلیف تو مجھے اس وقت بھی نہیں ہوئی جب ارغون، مغل اور ترخانوں نے مجھے اپنے گھوڑوں کے پاؤں تلے روندا تھا؛ میری تہذیب، میرے امن اور خوش حالی کو نیست و نابود کیا تھا۔

مجھے ماں کہنے والے، مجھے پاکستان کا ''معاشی مرکز'' کہنے والے آج میرے دعویدار تو ہیں مگر میرے حقوق اور فرائض کی جب بات آتی ہے تو سب پیچھے ہو جاتے ہیں۔میں آج زندہ لاش بن چکا ہوں، مجھ پر بڑی بڑی عمارتیں کھڑی کر کے میرے حسن کو جہاں داغ دار کیا جا رہا ہے وہیں میری آنے والی نسلوں کیلیے تباہی و بربادی کا سامان بھی پیدا کیا جا رہا

ہے۔سبزہ اور ندیاں کبھی میرا حسن اور پہچان ہوا کرتے تھے،آج وہ سب ختم کر دیے گئے۔ترقی کے باوجود میرے قیمتی اثاثے سمندر کو اپنی غلاظت سے بھرا جا رہا ہے،مجھ سے کمانے والے ہی مجھے گندا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔
آج میں سیاسی جماعتوں کیلئے صرف ایک ووٹ بینک کی حیثیت اختیار کر گیا ہوں،مجھ پر ہر شہر اور ہر گاؤں کے لوگ بستے ہیں،میں ان کیلئے روزی روٹی کا ذریعہ ہوں مگر پھر بھی مجھے یہ لوگ نا زیبا الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔میں نے قائداعظم کا خواب دیکھا تھا لیکن آج جس مقام پر میں کھڑا ہوں وہ اس کی تعبیر نہیں۔آج مجھ پر ضرورت سے زیادہ بوجھ ڈال دیا گیا ہے۔غیر قانونی تعمیرات،چائنہ کٹنگ اور بلڈر مافیا نے میرا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔
1843ء میں جب انگریزوں نے مجھ پر قبضہ کیا تھا تو مجھے بہت زیادہ تکلیف ہوئی تھی۔سوچا تھا اب یہ لوگ ترقی کے نام پر مجھ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑیں گے،لیکن یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ انگریزوں نے مجھے اپنا سمجھ کر مجھ پر انتہائی خوبصورت عمارتیں،سڑکیں،نالے اور ریلوے اسٹیشن بنا کر میرے حسن کو چار چاند لگا دیے۔میری نسلوں کو بہتر زندگی گزارنے کیلئے ایک بھرپور نظام فراہم کیا۔پھر جب تقسیم کا وقت آیا اور انگریز مجھے چھوڑ کر جانے لگیا تو میں اور بھی خوش ہو گیا کہ اب میرے اپنے مجھے سنبھال لیں گے،اب وہ اس قابل ہو گئے ہیں کہ مجھے خوب صورت ترین بنا دیں گے، میرا بھی اب دنیا میں نام ہو گا،یہ مجھے پھر میری کھوئی ہوئی پہچان لوٹائیں گے۔
مگر یہ کیا کہ میرے بچوں نے تو مجھے برباد ہی کر دیا۔90ء کی دہائی تک مجھ میں پھر بھی جینے کی کچھ امنگ باقی تھی،مگر اب میری جینے کی امنگ ختم ہو چکی ہے،میں اب زندہ لاش بن چکا ہوں۔اب مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کون کیا کر رہا ہے اور کون کیا نہیں کر رہا۔کوئی مجھ پر پان،گٹکا کھا کر تھوکتا ہے تو کوئی جہاں دل چاہے کچرا پھینک دیتا ہے؛ گندگی اور غلاظت سے میرا وجود مٹ چکا ہے۔دنیا جہان کی برائیاں لا کر مجھ میں سمو دی گئی ہیں۔
آج مجھ پر حکمرانی کا حق جتانے والے تو بہت ہیں مگر مجھے پھر سے زندگی کی امید دینے والا کوئی نہیں۔ہر کوئی اپنے اپنے مفادات کے چکر میں گم ہے۔میرا اب کسی کو خیال نہیں۔میرا ایک سوال ہے،ان سب سے جو مجھ پر بسیرا کرتے ہیں: آخر میرا قصور کیا تھا جو مجھے اس حال تک پہنچایا گیا؟ میں نے تو سب کا بھلا چاہا،پھر کیوں میرے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا اور مجھے دنیا بھر میں بدنام کیا گیا؟ کیا اپنوں کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے؟ مجھے ماں کہنے والے آج کہاں ہیں؟ کیا میری ممتا میں کوئی کسر رہ گئی تھی جو مجھے اس طرح دھتکار دیا گیا؟
سچ پوچھو تو میں آج بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں،مجھے زندگی چاہیے۔آج میں اپنا حق مانگتا ہوں،مجھے میرا حق چاہیے۔یاد رکھو! میں ہی تمہارا کل ہوں اور میں ہی تمہاری نسلوں کا محافظ بھی۔اگر میں نہ رہا تو پھر کچھ باقی نہیں رہے گا۔اب بھی وقت ہے مجھے سنبھال لو،مجھے میرا حق دے دو،مجھے میری زندگی لوٹا دو۔کیونکہ میں کراچی ہوں،اگر تم نے مجھے سنبھالنے میں دیر کی تو پھر تمہارے پاس پشیمانی کے سوا کچھ باقی نہیں رہے گا۔

کراچی سرکلر ریلوے، دیوانے کا خواب؟

کراچی میں پبلک ٹرانسپورٹ کے حوالے سے شہر قائد کے باسیوں کو ہر نئے سال میں جہاں ڈھیر ساری پریشانیاں نصیب ہوتی ہیں وہیں ایک خوشی کی خبر بھی دی جاتی ہے، جسے کراچی سرکلر ریلوے کہتے ہیں۔ یہ خوش خبری ہر سال یا پھر کبھی کبھی دو سال بعد ضرور سنائی جاتی ہے تاکہ جن مُردہ بسوں میں عوام سفر کررہے ہیں اسے مزید تقویت دی جاسکے۔

کراچی کے عوام کے نصیب میں آج بھی ٹرانسپورٹ کے نام پر 1960ء کی بسیں ہی لکھی ہیں، جنہیں ہر سال رنگ و روغن کرکے اسی سال کا مونوگرام لگا دیا جاتا ہے، تاکہ ٹرانسپورٹ مافیا اور حکومتِ سندھ سے بیزار عوام کو کچھ دلی تسکین حاصل ہوسکے۔

پبلک ٹرانسپورٹ کا مسئلہ حل کرنے اور شہر کے اہم مقامات کو ملانے کیلیے اندرون شہر ریل سروس کا منصوبہ جسے "کراچی سرکلر ریلوے" کا نام دیا گیا، سب سے پہلے 1976ء میں تجویز کیا گیا تھا۔

مگر اس پر بات کرنے سے پہلے ماضی پر ایک نظر ڈالی جائے تو ہمیں ٹرام، ڈبل ڈیکر اور کراچی میں چلنے والی بڑی بسیں نظر آئیں گی۔ ٹرام شہر قائد کیلیے سب سے پہلا ٹرانسپورٹ منصوبہ تھا جسے انگریز سرکار نے انتہائی قلیل عرصے میں عملی جامہ پہنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ یہ منصوبہ 1881ء میں کراچی میونسپلٹی کے انجینئر مسٹر جیمز اسٹریچن نے پیش کیا اور اسے منظوری کیلیے لندن بھیجا۔ 1883ء میں بمبئی حکومت کی جانب سے اسے منظور کرلیا گیا اور اسی سال ٹرام وی ایکٹ بھی منظور کیا گیا۔ ہمارے افسران کی دیانت داری دیکھیے کہ ٹرام وی ایکٹ آج بھی برقرار ہے۔

20 اکتوبر 1884ء کو شہر کراچی میں ٹرام کیلیے پٹریاں بچھانے کے کام کا آغاز ہوا۔ 20 اپریل 1885ء کو سندھ کے کمشنر مسٹر ہینری ارسکن نے قلیل عرصے میں مکمل ہونے والے اس منصوبے ٹرام وی نظام کا افتتاح کیا۔ ابتدا میں اسے کوئلے کے انجن سے چلایا جاتا رہا، جس کے شور سے لوگوں کا سکون برباد ہونے لگا، تاہم بعد میں انجن ہٹا کر ٹرام کو گھوڑوں کے ذریعے کھینچا جانے لگا۔ کچھ عرصے بعد 1909ء میں گھوڑا سروس بند کرکے پیٹرول انجن لندن سے منگوائے گئے۔ تیز رفتاری کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر پٹریاں تبدیل کی گئیں۔ پہلے سال ہی ٹرام نے اپنی مقبولیت کے

جھنڈے گاڑ دیے اور ایک سال میں 5 ملین کے قریب لوگوں نے اس پر سفر کیا۔

1913ء میں ٹراموں کی تعداد 37 ہوگئی۔ ہر ٹرام میں 46 مسافروں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ ٹرام کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے انگریز سرکار نے ڈبل ڈیکر بس سروس بھی شروع کی۔ جہاں ٹرام سروس نہیں تھی وہاں بسیں چلائی جانے لگیں۔

تقسیم ہند کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے ٹرام کمپنی کی فروخت کیلیے ٹینڈر طلب کیے جس میں سب سے کامیاب بولی محمد علی نامی شخص نے لگائی۔ انہوں نے یہ نظام محض 32 لاکھ روپے میں خرید کر کمپنی کا نام محمد علی ٹرام وی کمپنی رکھ دیا۔ فروری 1948ء میں 65 ٹرام اور 65 بسیں محمد علی کمپنی کی ملکیت تھیں، جنہیں چلانے کیلیے 1100 ملازمین تھے۔ 1960ء میں محمد علی کمپنی نے بس سروس بند کر دی۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد ٹرام کے انجن پٹرول سے ہٹا کر ڈیزل پر کر دیے گئے اور اس میں مسافروں کی گنجائش بھی بڑھا کر 65 کر دی گئی، جب کہ ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کی تربیت کیلیے ایک اسکول بھی بنایا گیا تھا۔

30 اپریل 1975ء کا دن کراچی کی تاریخ کا ایک بدترین دن ثابت ہوا، جب آخری ٹرام نے اپنا سفر بندر روڈ سے بولٹن مارکیٹ تک مکمل کیا۔ 1974ء میں حکومت نے ٹرام ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ حکومت کا موقف تھا کہ بندر روڈ پر ٹریفک بڑھنے کے باعث ٹرام سے شدید مشکلات پیش آ رہی ہیں۔ جس پر کمپنی نے نظام کو مکمل لپیٹ لیا اور ٹرام کے ساتھ پٹریاں بھی اسکریپ کر دیں۔ کہتے ہیں آپ کا ماضی آپ کے مستقبل سے جڑا ہے۔ زندہ قومیں ہمیشہ اپنے ماضی کو زندہ رکھتی ہیں، تاہم یہاں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ 1975ء میں ٹرانسپورٹ کی تاریخ کا اہم باب بند ہوگیا۔ اس کے بعد کسی نے بھی ٹرام کی شکل نہیں دیکھی۔

1964ء میں کراچی میں "کراچی سرکلر ریلوے" کا منصوبہ بنایا گیا جسے دو حصوں میں مکمل کیا گیا۔ پہلے مرحلے میں ڈرگ روڈ کو لیاری اسٹیشن سے ملایا گیا، اور پھر دوسرے مرحلے میں اسی ٹریک کو لیاری سے کراچی سٹی اسٹیشن تک جوڑ دیا گیا۔ 1969ء میں اس روٹ پر 24 مسافر ریل گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔ پھر وہی ہوا جو ٹرام کے ساتھ ہوا تھا، سازش کے تحت اس نظام کو ناکام بنانے کیلیے پہلے ریل گاڑیوں کو لیٹ کرنا شروع کیا گیا، اور بعدازاں بس مالکان نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی اندھی کمائی میں اضافہ کیا۔ 1980ء کی کامیاب سواری 1990ء میں مسافروں کی عدم دلچسپی اور بس مالکان کی سازشوں کے باعث تباہ ہونا شروع ہوگئی۔ 1994ء میں کئی ریل گاڑیاں یہ کہہ کر بند کر دی گئیں کہ خسارہ بڑھ رہا ہے۔ اور 1999ء تک لوپ لائن پر چلنے والی واحد ریل گاڑی کو بھی مکمل طور پر بند کر دیا گیا۔

یہ ٹرام اور کراچی سرکلر ریلوے کا شاندار ماضی تھا۔ اب حال دیکھیں تو حکومت کی ٹرانسپورٹ پالیسیاں دیکھ کر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے، جس نے پرائیویٹ سیکٹر کو فائدہ پہنچانے کیلیے شہر قائد کے باسیوں سے بہترین اور جدید ٹرانسپورٹ نظام چھین کر انہیں مافیا کے سامنے بے بس کر دیا۔ اب لکیر پیٹنے سے کیا فائدہ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت والا معاملہ

ہے ۔19 برسوں سے عوام کو کراچی سرکلر ریلوے کا خواب دکھایا جا رہا ہے ... کبھی منصوبے کی فزیبلٹی اسٹڈی کر کے، تو کبھی مختلف فورمز پر اس کی منظوری لے کر... لیکن نتیجہ آج بھی وہی ہے، یعنی ڈھاک کے تین پات ۔

ٹرام وے سسٹم کے خاتمے کے بعد کراچی سرکلر ریلوے کے ساتھ کراچی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا قیام عمل میں لایا گیا۔ KTC نے کراچی میں درآمد شدہ بسوں سے ایک سسٹم قائم کیا اور ایک عرصے تک یہ سسٹم کراچی کے شہریوں کی ٹرانسپورٹ کی ضرورت پوری کرتا رہا۔ ہزارہا افراد ان بسوں سے بہ سہولت سفر کیا کرتے تھے۔ لیکن 1997 میں کے ٹی سی اور 1999ء میں سرکلر ریلوے کو ختم کر کے شہر کو ٹرانسپورٹ مافیا کے سپرد کر دیا گیا جس نے کراچی میں منی بسیں متعارف کرائیں، یہ منی بسیں پبلک ٹرانسپورٹ کے معیار پر بالکل بھی پورا نہیں اترتی تھیں، جو منی ٹرک کے چیسز پر باڈی بنا کر بس کی صورت میں ڈھالی گئی تھیں۔ شہری ان ڈربہ نما بسوں میں بھیڑ بکریوں کی طرح سفر کرنے پر مجبور ہو گئے۔

وقت کے ساتھ یہ بسیں بھی خستہ حال ہو گئیں، لیکن کراچی کے بدنصیب شہریوں کے نصیب میں یہی بسیں رہ گئیں۔ ان بسوں میں سفر کی اذیت کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ نجی شعبے نے بسوں سے ٹکٹ کا نظام ختم کیا اور زیادہ سے زیادہ منافعے کو اپنا شعار بنایا۔ غوث علی شاہ کے دور میں ٹریفک انجینئرنگ بیورو قائم ہوا، بے نظیر بھٹو کے پہلے دور میں ماس ٹرانزٹ پروگرام پر عملدرآمد کا ذکر ہوا مگر معاملہ اخبارات کے صفحات تک محدود رہا۔ میاں نواز شریف نے اپنے پہلے دور میں ییلو کیب اسکیم شروع کی۔ اس اسکیم کے تحت قومی بینکوں نے ٹیکسیوں کی خریداری کیلیے اربوں روپے قرضے دیئے، جس کی وجہ سے 3 قومی بینک دیوالیہ کے قریب بھی پہنچ چکے تھے۔

کراچی ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے خاتمے کے بعد 2008 میں کراچی اربن ٹرانسپورٹ کارپوریشن کے نام سے ایک نیا ادارہ تشکیل دیا گیا جس میں 60 فیصد شیئر پاکستان ریلوے اور 25 فیصد حصہ سندھ حکومت کا رکھا گیا اور 15 فیصد کے ایم سی کو ملنے تھے۔ جب کہ کے یو ٹی سی نے کے سی آر کے منصوبے پر عملدرآمد کرنا تھا۔ تاہم یہ منصوبہ بھی کاغذوں تک محدود رہا اور اس پر بھی کوئی عمل نہیں کیا گیا۔

عوام کو بہلانے کیلیے سندھ گورنمنٹ نے وزیراعلیٰ ہاؤس میں بس ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم، گرین لائن اور اورنج لائن جیسے منصوبوں کو تو جنم دیا لیکن یہ منصوبے کچھ ہی دن میں وزیراعلیٰ ہاؤس میں ہی دم توڑ گئے۔ اور کراچی کے عوام کسی بھی کلر کی لائن والے ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم کے منصوبے پر عملدرآمد کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ تاہم مصطفیٰ کمال کے دور میں گرین لائن بس سروس شروع کی گئی تھی لیکن بعدازاں وہ بھی سازشوں کی نذر ہو کر ختم ہو گئیں۔

ایک وقت تھا جب پاکستان کا بڑا شہر کراچی ٹرانسپورٹ کی سہولتوں سے مالا مال تھا۔ ہر روٹ پر بڑی بسیں چلا کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ مزدا، فورڈ کوچز اور دوسری چھوٹی گاڑیاں بھی بڑھتی ہوئی آبادی کو ٹرانسپورٹ کی سہولتیں فراہم کرنے لگیں۔ مگر حکومتیں کراچی میں ٹرانسپورٹ کی فراہمی سے ہمیشہ بے نیاز ہی رہیں۔ سندھ ٹرانسپورٹ، اومنی بس سروس

کراچی ٹرانسپورٹ کارپوریشن اور اربن ٹرانسپورٹ UTS نے مختلف ادوار میں کراچی کی سڑکوں پر بسیں چلائیں مگران اداروں کو جلد مافیا نے ٹھکانے لگادیا۔

کراچی سرکلر ریلوے منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں آج بھی دو اہم چیزیں رکاوٹ بن رہی ہیں: (1) تجاوزات اور قبضہ مافیا، اور (2) پرائیوٹ پبلک ٹرانسپورٹ نظام۔ کینیڈا اور جاپان کی کمپنیوں نے اس پر کام کرنے سے پہلے ہی راہِ فرار اختیار کرنے میں اپنی عافیت جانی۔ شاید انہیں بھی علم ہوگیا تھا کہ کراچی میں یہ دو گروپ انتہائی طاقتور رہیں اور حکومت ان کے سامنے بے بس ہی رہے گی۔ اور شاید حقیقت بھی یہی ہے۔ جس کی وجہ سے آج تک اس منصوبے کو کبھی عملی جامہ پہنانے کی کوشش تک نہیں کی گئی۔

ماضی میں جب بھی کراچی سرکلر ریلوے کی بحالی کے خواب کو حکومت نے تعبیر دینے کی کوشش کی تو ناظم آباد، غریب آباد، گلشن اقبال، لیاری سمیت کراچی سرکلر ریلوے کے روٹ پر آنے والے دیگر علاقوں میں متعلقہ اداروں کو وہاں کے رہائشیوں کی جانب سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاہم حکومت سندھ نے اس پر کوئی مذاکرات کرنے یا باسیوں کو متبادل جگہ دینے کے بجائے اب کراچی سرکلر ریلوے کی بحالی مشن کو ہی دفن کرنا شروع کردیا جس کی تازہ مثال یہ ہے کہ ناظم آباد پل گرا کر وہاں میٹرو بس کیلیے سڑک ہموار کردی، اور کراچی سرکلر ریلوے کیلیے بچھائی گئی لائن کو اس میں ہمیشہ ہمیشہ کیلیے دفن کردیا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حکومت کراچی سرکلر ریلوے کی بحالی کیلیے کتنی سنجیدہ ہے۔

2003ء، 2005ء، 2013ء، 2014ء اور اگست 2017ء میں اس منصوبے کی بازگشت سنائی دی۔ تاہم 2017ء میں عوام کو جدید طریقے سے بے وقوف بنانے کیلیے سی پیک کا راستہ اختیار کیا گیا اور منصوبہ یہ کہہ کر ایک چینی کمپنی کے حوالے کردیا گیا کہ وہ اسے مکمل کرکے سی پیک کا حصہ بنائے گی۔ لیکن آج چینی کمپنی کو بھی تجاوزات کا سامنا ہے اور حکومت اب بھی اس مسئلے پر سنجیدہ دکھائی نہیں دے رہی۔

ستمبر 2017ء میں اس منصوبے پر کام کا آغاز کیا جانا تھا، اور اس کی تکمیل 2020ء تک ہونی ہے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ نہ اس منصوبے پر کوئی پیش رفت ہوئی اور نہ ہی اس پر کوئی کام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اب کراچی سرکلر ریلوے کراچی کے باسیوں کیلیے کسی دیوانے کے خواب کی طرح ہے، جو کبھی تعبیر نہیں پاتا۔

ریاست مدینہ میں مجبور باپ کی خودکشی

''بابا مجھے سردی لگ رہی ہے ۔ مجھے بھی گرم کپڑے لے کر دو ناں ۔ مجھے سردی لگتی ہے ان کپڑوں میں ۔'' ایک بیٹی اپنے تین ماہ سے بے روزگار باپ سے فرمائش کر رہی ہے اور باپ بے بسی کا مجسمہ بن کر صرف سن رہا ہے۔ اس کے اندر اتنی ہمت نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کو جھوٹا دلاسہ ہی دے سکے کہ ہاں میری شہزادی! میں تمھیں آج ضرور گرم کپڑے لے کر دوں گا۔ لیکن بے کس و مجبور باپ اتنی ہمت بھی نہ کر پایا اور اس نے اپنی شہزادی کی خواہش کے آگے موت کو گلے لگانا بہتر سمجھا اور خود کو آگ لگا دی' اور آگ بھی وہاں لگائی جہاں اس کی پیاری بیٹی نہ دیکھ سکے۔

کراچی کے علاقے ابراہیم حیدری کا تنگ دست و مجبور خاندان اپنے پیارے کو اسپتال لے کر گیا لیکن میر حسن کے اندر جینے کی تمام خواہشیں ختم ہو چکی تھیں۔ وہ اس جعلی ریاست مدینہ میں جینا ہی نہیں چاہتا تھا، وہ ایسی ڈھونگی سرکار کے آسرے پر مزید اپنے بچوں کے سامنے خود کو شرمندہ اور بے بس نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔ یہ وجہ موت کا بہانہ بن گئی جہاں ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر میر حسن کی لاش اس کے پیاروں کے حوالے کر دی کہ میر حسن زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا ہے۔

میر حسن تو چلا گیا لیکن جاتے جاتے اپنے پیچھے کئی سوالات چھوڑ گیا۔ اس کا پہلا سوال یہ تھا کہ کیا یہ وہی ریاست مدینہ ہے جس کا عمران خان نیازی نے ہمیں خواب دکھایا تھا؟ کیا روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانے والے مجھے روزگار نہیں دے سکتے تھے؟ کیا پاکستان کے عالیشان وزیراعظم ہاؤس، قومی و صوبائی اسمبلیوں میں بیٹھے امیر ترین لوگ مجھ جیسوں کیلیے آواز نہیں اٹھا سکتے؟ کیا اس ڈھونگی اور بوگس ریاست پر میری کوئی ذمے داری نہیں؟ میں نے تو سنا ہے کہ پاکستان زرخیز خطہ ہے، لیکن کیا میرے ملک میں اتنے وسائل بھی نہیں کہ وہ مجھ تک پہنچ سکتے؟ کیا ریاست آج اتنی تنگ دست ہو چکی ہے کہ اس کے پاس میرے جیسے لوگوں کیلیے خزانے میں کچھ نہیں بچا؟ کیا آج اسمبلی میں بیٹھے ڈھونگی حکمرانوں کے خزانے خالی ہو چکے ہیں؟ کیا میرے بچوں کی ایک ادنیٰ سی خواہش بھی کبھی پوری ہوگی؟ کیا میری شہزادی کبھی گرم

کپڑے پہن پائے گی، جسے سردی بہت لگتی ہے؟ کیا میرے آنگن کے یہ ننھے پھول کبھی تناور درخت بن پائیں گے؟ کیا کبھی اس ملک میں انہیں ایک بہتر زندگی میسر ہوگی؟ اس طرح کے لاتعداد سوالات، جس کا جواب دینا یقیناً ریاست کی ذمےداری ہے۔ لیکن افسوس کہ وفاق کے ساتھ ساتھ صوبائی ڈرامے باز حکومتیں بھی اس معاملے پر خاموش تماشائی بنی ہوئی ہیں۔

گل سبھی کے آنگن میں کھلتے ہیں، مگر پروان نصیبوں کے چڑھتے ہیں۔ عمران خان کی نگرانی میں قائم اس ریاست میں بھی یہی رواج قائم ہے کہ گل سبھی کے آنگن میں کھلیں گے مگر پروان صرف وہ گل ہوں گے جسے ریاست چاہے گی۔

ریاست اپنی منافقت سے بھری کفر کی حکومت قائم کر کے اسے ریاست مدینہ کا نام دے کر سمجھ رہی ہے کہ عوام بے وقوف ہیں۔ انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آرہی جو اپنی عیاشی میں خود کو خدا بنائے خدا کو ہی بھول بیٹھے ہیں۔

میر حسن کی خودکشی نہ پہلی تھی اور نہ ہی آخری ہوگی۔ یہ سلسلہ رکنے والا نہیں۔ اب بے کس مجبوروں کو ایک آسرا مل چکا ہے کہ وہ ان تمام پریشانیوں سے چھٹکارے کیلیے خودکشی کا راستہ اپنائیں۔ لیکن یہ خودکشیاں کب تک ہوں گی؟ اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

شاید وطن عزیز میں ابھی انقلاب کا آغاز نہیں ہوا۔ لیکن جب بھی ایسے عیاش پرست حکمرانوں کے خلاف کوئی تحریک شروع ہوئی وہ دن اس ملک میں انقلاب کی نوید لائے گا۔ اور اگر کوئی حکمران یہ سمجھ رہا ہے کہ میر حسن اور ان جیسوں کی خودکشی ایک معمولی واقعہ ہے تو وہ بھول رہے ہیں، جلد یا دیر ان کا وقت قریب آنے والا ہے۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق پانچ سال کے دوران کراچی میں تیرہ سو سے زائد خودکشی کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ یہ وہ ریکارڈ ہے جو سرکاری اسپتالوں اور تھانوں میں درج ہے۔ لیکن ایسے کئی واقعات ہیں جن کا کہیں اندراج نہیں، اور یہ ایک بہت بڑی تعداد ہے۔ عوام بہتر زندگی اور سہولیات کی فراہمی کیلیے ان کو اپنا مسیحا سمجھ کر ووٹ کے ذریعے انتخاب کرتے ہیں اور انہیں اپنے سر آنکھوں پر بٹھا کر اسمبلیوں تک پہنچاتے ہیں۔ لیکن یہ لوگ وہاں پہنچ کر اپنی اوقات بھول جاتے ہیں۔ اسمبلی تک آنے کیلیے جو اخراجات یہ لوگ ادا کرتے ہیں وہ سود سمیت واپس لیتے ہیں اور چلتے بنتے ہیں۔ اسمبلیوں میں اپنی مرضی کے قوانین بنانے اور عوام کو اپنی جوتی کی نوک پر بٹھانے کے سوا آج تک اس ملک میں کوئی کام ایمانداری سے نہیں کیا گیا۔

ہمارے حکمران سمجھتے ہیں آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع پوری قوم کا مسئلہ ہے، جسے حل کر کے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خیبر کا قلعہ فتح کر لیا ہے۔ لیکن در حقیقت یہ ان کا ذاتی مسئلہ ہے۔ آرمی چیف کی مدت ملازمت سے عوام کو کوئی لینا دینا نہیں۔ جب کوئی آمر حکومت کرتا ہے تو یہی لوگ کہتے ہیں فوج کا حکومت میں کیا کام؟ تو پھر ان کے ریٹائر ہونے اور نہ ہونے سے عوام کو کیا فرق پڑتا ہے۔ آرمی چیف نہ تو عوام کو بجٹ بنا کر دیتا ہے اور نہ ہی عوام کو روزگار فراہم کرتا ہے۔

اس کا کام آئین نے متعین کیا ہوا ہے۔ یہ ڈرامے بازیاں صرف عوام کیلیے رکھی جاتی ہیں، جنہیں ان مسائل میں زبردستی جھونک کر اپنا الو سیدھا کیا جاتا ہے۔ یہ سب عوام کو ڈرانے اور نیچے دبانے کیلیے کیا جاتا ہے، تاکہ وہ سر نہ اٹھا سکیں۔

ریاست مدینہ کی بات کرنے اور اپنے ہر بیان میں کسی نہ کسی حدیث اور یورپ کا حوالہ دینے والے عمران خان نے بیان دیا ہے کہ ہماری سب سے بڑی کوشش ایران اور امریکا کے درمیان دوستی کرانا ہے۔ وزیراعظم کے اس بیان پر عوام جاننا چاہتے ہیں کہ اس سے پاکستان کے غریب عوام کو کیا فائدہ ہونے جا رہا ہے؟ کیا اس سے مہنگائی کم ہو جائے گی؟ کیا ان کی دوستی سے بے روزگاروں کو روزگار ملنا شروع ہو جائے گا؟ کیا ان کی دوستی کے بعد عمران خان اس بات کی گارنٹی دیتے ہیں کہ ملک میں ہر طرف امن اور خوشحالی آجائے گی؟

ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ یہ سب اپنے اپنے مفادات کی جنگیں ہیں۔ کیا ان حکمرانوں کو یہ معلوم نہیں کہ امریکا اور ایران کسی وقت ایک دوسرے کے بہت بڑے اتحادی رہے ہیں۔ کیا یہ لوگ بھول گئے کہ ایران اور امریکا نے کن کن مراحل پر پاکستان کو دھوکا دیا؟ کیا انہیں یہ بات معلوم نہیں کہ کلبھوشن کہاں سے پکڑا گیا اور کس نے اس کی مدد کی؟ کیا ہمارے وزیراعظم کو یہ معلوم نہیں کہ ایران بھارت کا سب سے بڑا سپورٹر ہے؟

میر حسن کی موت کی ذمے دار ریاست ہے اور اس کے خلاف مقدمہ درج ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس اسی بات کا ہے جس شخص کو ان ڈھونگیوں سے کچھ مل جاتا ہے وہ ان کے گن گانا شروع ہو جاتا ہے۔ ہر کوئی اپنے اپنے مفادات کی خاطر جی رہا ہے اور لڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری اس مفادات کی لڑائی کا فائدہ اٹھا کر ہم پر من پسند حکمرانی کر رہے ہیں۔

معاشی ترقی یا غریب کی موت؟

الحمدللہ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو چکا ہے۔سی پیک پاکستان کی معیشت میں انقلاب لائے گا۔آئی ایم ایف سے آئندہ قرض نہیں لیں گے۔عوام کو ریلیف دے رہے ہیں۔غربت کے خاتمے کیلیے کئی منصوبوں پر کام چل رہا ہے۔ فلاں پروگرام سے غریب آدمی کو فائدہ پہنچے گا۔بجٹ عوام دوست ہے۔ترقی کی مثال قائم کرنے جا رہے ہیں۔صبح سے شام اور شام سے رات تک سیاسی مداریوں کے منافقت سے بھرے بیانات میڈیا اس طرح دکھاتا ہے جیسے واقعی ترقی میں ہم امریکا سے بھی دس گنا زیادہ آگے نکل چکے ہیں۔

معاشی ترقی کا شور مچانے والے شاید غریب کی چیخیں سننا ہی نہیں چاہتے کہ وہ کس حال میں جی رہے ہیں۔ان کی صبح کس طرح ہوتی ہے اور ان کے گھروں میں رات کو کیا قیامت کے کیا مناظر ہوتے ہیں؟بچوں کے دودھ سے لے کر گھر کے راشن تک کے معاملات میں گھروں میں لڑائی جھگڑے عام ہوتے جا رہے ہیں۔بیس ہزار روپے ماہانہ کمانے والا شخص کس طرح اپنے گھریلو اخراجات پورے کر رہا ہے،یہ وہی جانتا ہے یا پھر اس کا خدا جانتا ہے۔کوئی نہیں جانتا تو بس حاکم وقت نہیں جانتا۔

ہمارے موجودہ حاکم وقت کو جہاں ہر بات میڈیا کے ذریعے معلوم ہوتی ہے،وہیں ٹوئٹر کے ذریعے بیان داغ کر اپنا فرض پورا کرنا آتا ہے۔ملک میں مہنگائی کا رونا کوئی نئی بات نہیں۔ہر حکومت نے اپنے اپنے حصے کی مہنگائی کی اور اپنے اپنے مفادات سمیت کر چلتی بنی۔لیکن موجودہ حکومت نے مہنگائی کے تمام ریکارڈ توڑ کر واقعی اس نعرے کو عملی جامہ پہنایا ہے کہ غربت کے خاتمے کیلیے غریب کو مرنا ہوگا۔اس کام کو سرانجام دینے کیلیے حاکم وقت کے پاس انتہائی ایماندار کابینہ موجود ہے،جو نت نئے طریقوں سے عوام کو روزانہ تھوڑا تھوڑا مار کر اپنے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے میں مگن ہے۔

عوام کو آج دو وقت کی روٹی تک میسر نہیں۔غربت کا یہ عالم ہے کہ پہلے لوگ اپنے بچوں کو فروخت کیا کرتے تھے مگر اب بچے خود ہی بھوک سے مر رہے ہیں۔آج لوگوں کے حالات زندگی اس نہج پر آ پہنچے ہیں کہ دس روپے کی چینی اور پانچ

روپے کی پتی خرید کر صبح کا ناشتہ کر رہے ہیں۔ کئی گھرانے تو اس سے بھی محروم ہیں۔
اپنے علاقے کی دکان پر ایک ایسے بچے سے ملاقات ہوئی جس نے دکان پر آ کر یہ کہا کہ انکل کچھ کھانے کو دیں گے؟ میں ساتھ ہی کھڑا تھا۔ دکان والے نے تو حسب روایت اس بچے کو جھڑک دیا کہ چلو بھاگو یہاں سے۔ مگر نجانے کیوں مجھے وہ بچہ بھکاری نہیں بلکہ موجودہ حاکم وقت کے ظلم کا شکار اور مجبور و بے کس لگا۔ میں نے دکان والے کو پیسے دیے اور کہا بچے کو جو چاہیے وہ دے دو۔ اس بچے نے جب دکان والے سے یہ کہا کہ انکل ان پیسوں سے آٹا آ جائے گا؟ تو میرے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ بچہ کوئی چاکلیٹ وغیرہ لے گا اور چلا جائے گا مگر بچے نے آٹے کا مطالبہ کر کے جہاں ہم جیسوں کو شرمندہ کر دیا، وہیں حاکم وقت پر عذاب نازل ہونے کی بھی نوید سنا دی۔ معلوم نہیں وہ کب سے بھوکا ہوگا اور گھر کے کیا حالات رہے ہوں گے۔ یہ وہ بچہ ہی جانتا ہے۔
بچے کے معصوم سوال پر میں نے اس سے پوچھا "بیٹا آپ کے گھر پر آٹا نہیں ہے؟" تو اس بچے نے انتہائی معصومیت سے صرف گردن ہلا کر ہاں میں جواب دیا۔ پھر مزید اصرار پر اس نے بتایا کہ ابو کام پر گئے ہیں، ہم نے کل رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا، اور صبح ناشتے میں بھی امی نے کچھ نہیں دیا۔ امی کہتی ہیں آٹا ختم ہو گیا ہے۔ ابو کو پیسے ملیں گے تو آٹا لے کر آئیں گے۔ لیکن مجھے پتہ ہے ابو کام پر چلے گئے ہیں اور وہ اب رات کو ہی آئیں گے۔ اس ننھے فرشتے کی باتیں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں۔ سمجھ نہیں آ رہا تھا اس وقت کیا کیا جائے۔ تاہم میں دس کلو آٹے کا تھیلا لے کر بچے ساتھ اس کے گھر تک چل پڑا۔ دروازہ کھلا تھا، بچہ سیدھا اندر گیا اور کچھ دیر بعد بچے کے ساتھ ایک خاتون باہر نکلیں۔ میں نے آٹے کا تھیلا انھیں پکڑایا اور یہ کہہ کر جانے لگا کہ بچے کو بھوک لگی ہے اسے روٹی بنا دیں۔ آٹے کا تھیلا ان کی دہلیز پر رکھ کر میں واپس مڑا اور جانے لگا تو خاتون نے صرف ایک جملہ ادا کیا "بیٹا اللہ آپ کو اور دے"۔
یہ کہانی ایک گھر کی نہیں۔ یہ کہانی آج ہر گھر کی ہے۔ کراچی کی آبادی رئیسوں اور امیر زادوں پر مشتمل نہیں۔ یہاں اکثریت مزدور طبقے کی ہے جو روز صبح فیکٹریوں، کارخانوں، مزدوری، ٹھیلے اور پتھاروں پر اپنی روزی روٹی کی تلاش میں گھر سے باہر نکلتے ہیں اور شام کو واپسی پر ان کی جیب میں محض اتنی رقم ہوتی ہے کہ بمشکل ایک وقت کی روٹی اپنے کنبے کو کھلا سکیں۔ میرا روزانہ ایسے کئی لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو غربت کی انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں۔
ایسی ہی ایک اور فیملی سے چند روز قبل میری ملاقات ہوئی۔ گھر کا واحد کفیل بستر مرگ پر تھا اور گھر کے حالات کچھ اس طرح تھے کہ ایک زیرو کا بلب پورے کمرے کو دھیمی روشنی سے روشن کرنے کی ناکام جسارت کر رہا تھا۔ ظہور خان کے دونوں گردے فیل ہو چکے ہیں اور وہ ایس آئی یو ٹی سے علاج کرا رہا ہے۔ تین بیٹیوں کا باپ گھر پر کھانستے کھانستے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔ جب کہ گھر میں دو وقت کی روٹی کبھی پڑوس سے آتی ہے تو کبھی فاقے پر گزر بسر کر لیتے ہیں۔ بڑی بیٹی کی عمر 9 سال جب کہ سب سے چھوٹی کی عمر ایک سال ہے۔ بیٹی اسکول اس لیے نہیں جاتی کہ باپ کے پاس پیسے نہیں کہ وہ اسے اسکول میں داخل کرا سکے۔ بیوی کو اردو نہیں آتی، اس لیے وہ کہیں کام بھی نہیں کر سکتی۔ اب اس

گھر کے بارے میں مزید کیا لکھوں جہاں غربت نے اپنے پنجے گاڑے ہوں۔امید کرتا ہوں یہ گھر بھی حاکم وقت کیلیے غرور عذاب کا سبب بنے گا۔

ہمارے ڈرامے باز سیاستدان اپنی جمہوریت کو بچانے کیلیے سر جوڑے بیٹھے ہیں۔کبھی آرمی چیف کے معاملے پر قانون سازی کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے تو کبھی حریم شاہ پر ملک کے مستقبل کا فیصلہ رکھا جا رہا ہے۔وزیر اطلاعات کی بڑی بی جب بھی ترجمانی کیلیے بن ٹھن کر میڈیا کے سامنے آتی ہیں تو ان کے منہ سے سوائے اپنی حکومت کی نا اہلی چھپانے کے کچھ نہیں نکلتا۔غریب کا مذاق اڑانے میں بھی یہ لوگ پیش پیش ہیں۔عوام ہر چیز پر ٹیکس دے رہے ہیں مگر انہیں سہولیات کے نام پر سوائے موت کے کچھ نہیں دیا جا رہا۔عوام کو ہر بجٹ میں سلو پوائزن دینے کی روایت اپنائی گئی۔ وطن عزیز میں سب سے زیادہ ٹیکس یہی غریب طبقہ جو آج غربت کی لکیر سے بھی نیچے کی زندگی گزار رہا ہے ادا کر رہا ہے۔جنہیں بنیادی ضروریات کے نام پر ہمیشہ دھوکا دیا جاتا ہے اور مرنے کیلیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

صحیح کہتے ہیں جب حاکم وقت کے دروازے صرف طوائفوں کیلیے کھولے جائیں تو سمجھ جائیں اس ملک پر خدا کا شدید عذاب نازل ہونے والا ہے۔تاہم پاکستان پر یہ عذاب نازل ہو چکا ہے، جس کی وجہ سے آج سفید پوش لوگ بھکاری بن کر دگر گوں ہیں۔لیکن ہمارے سیاسی ڈرامے باز اداکاروں کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔ ان غریبوں کی آہیں نہ تو کبھی اس ملک کو ترقی دلا سکتی ہیں اور نہ ہی ہم کبھی ترقی کا خواب پورا کر سکتے ہیں۔ہمارے بینکوں میں اگر اربوں ڈالر بھی ہوں تب بھی ہم خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ریاست مدینہ کی بات کرنے والے کفر کی حکومت قائم کیے ہوئے سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کو بہتر کر دیا۔لیکن شاید وہ نہیں جانتے کہ ہر عروج کے بعد زوال ہوتا ہے۔ ابھی یہ ان کا عروج ہے، لیکن جلد یا بدیر زوال کی طرف بھی لوٹنا ہے۔

عوامی حکومت یا ہماری حکومت؟

کئی سال بعد ایک دوست سے اچانک سے ملاقات ہوئی، جسے میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ چہرے پر جھریاں، بالوں میں چاندی اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے وہ گلی گلی پھیری لگا کر سبزی فروخت کر رہا تھا۔ سبزی والے کی آواز سن کر میں گھر سے یہ سوچ کر باہر نکلا کہ اب مارکیٹ کون جائے، اچھا ہوا سبزی والا گلی میں ہی آ گیا۔ جیسے ہی دروازہ کھول کر سامنے کھڑے سبزی والے پر نظر پڑی تو چہرہ شناسا سا لگا۔ وہ ایک سرسری سی نظر مجھ پر ڈال کر اپنے ٹھیلے پر رکھی سبزیوں کو سیٹ کرنے لگا اور ساتھ ہی آواز بھی لگاتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی مطلوبہ سبزی لی اور بار بار اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جب مجھ سے رہا نہ گیا تو میں نے اس سے پوچھ ہی لیا "بھائی آپ کا نام ضمیر تو نہیں؟"

میرے یہ الفاظ اس کیلئے ایٹم بم سے کم نہ تھے۔ جب اس نے مجھے بغور دیکھا تو قریب آیا اور کہنے لگا "آپ ظفر صاحب تو نہیں؟" میں نے جواب دیا کہ ظفر صاحب نہیں صرف ظفر ہوں۔ اور اس کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔

میرے اس دوست کے حالات کیوں خراب ہوئے، اس کا جواب تو ہمارے حکمرانوں کو دینا چاہیے لیکن ضمیر اسے اپنا کیا مانتا ہے۔ بقول اس کے آج سے 8، 10 سال قبل اس کا کام بہت اچھا چل رہا تھا۔ پھر جیسے جیسے مہنگائی بڑھتی گئی کاروبار کم ہوتا گیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کارخانے میں کاریگروں کی تنخواہ تک نکالنا مشکل ہو گیا۔ جس کے بعد بالآخر اسے اپنا کارخانہ بند کرنا پڑا۔ کاروبار ختم ہونے کے بعد اس نے ایک بد گر کا ٹھیلا لگا کر اپنے گھر کی گاڑی کو گھسیٹنا شروع کر دیا۔ لیکن پھر عوامی حکومت سے یہ بھی برداشت نہیں ہوا۔ اس لیے انکروچمنٹ کے نام پر اس کا ٹھیلا اٹھانے کی دھمکی دے کر اس سے ہفتہ (بھتہ) بڑھانے کا مطالبہ کیا گیا اور اس غریب نے اپنے بچوں کا حق حلال کا رزق سرکاری ملازمین کو، جو ہمارے ہی ٹیکس کے پیسوں سے تنخواہیں وصول کرتے ہیں، دینا شروع کر دیا۔

یہ سلسلہ یہیں تک محدود نہ رہا، بلکہ ہر روز کوئی افسر آتا اور پیسے لے کر چلتا بنتا۔ جس کے بعد ضمیر کیلئے گھر کی دال روٹی بھی مشکل ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے پھر بھی ہمت سے کام لیا اور جہاں وہ اپنے بچوں کا رزق مشکل سے پورا کر رہا تھا، وہیں

وہ روزانہ سرکاری ملازمین کے دوزخ کو بھی بھر رہا تھا۔ پھر ایک دن اچانک اس سے ہفتے کے پانچ ہزار روپے کا تقاضا کیا گیا اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر اتنے پیسے دے سکتے ہو تو ٹھیک ہے، ورنہ کل سے تمہارا ٹھیلا یہاں نظر نہیں آنا چاہیے۔ صاحب بہت بگڑا ہوا ہے کہتا ہے پیسے بڑھاؤ یا ٹھیلا ہٹواؤ۔ اب تمہاری مرضی ہے۔

ضمیر کی آنکھیں نم ہو چکی تھیں۔ اس کے دل سے ان لوگوں کیلیے دعا تو نکل ہی نہیں سکتی۔ ضرور آسماں کی طرف دیکھ کر اپنے رب سے ہی اپنے حالات کا تذکرہ کر رہا ہو گا اور زمینی خداؤں کی شکایت بھی۔ ضمیر کے مطابق اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بیٹی جو 10 سال کی ہے وہ پیرالائز ہے۔ نہ وہ خود سے کھا سکتی ہے اور نہ ہی بول اور سن سکتی ہے۔ اس کا روز کا خرچہ ہی کم از کم 500 سے 800 روپے ہے۔ اس کے بعد ایک بیٹا ہے جو ابھی اسکول جانا شروع ہوا ہے۔ جب کہ ایک بیٹی سال بھر کی ہے۔ ایک کمرے کے مکان میں رہائش پذیر ضمیر اس کا کرایہ ہی 8000 روپے دے رہا ہے۔ اس کے بعد 4000 روپے تک بجلی اور گیس کے بل بھرتا ہے۔ ایسے میں ہفتے کے 5 ہزار روپے محض حرام کی نذر کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لہٰذا اس نے ہفتے کے 5 ہزار روپے دینے سے انکار کر دیا۔

ضمیر کے انکار کرتے ہی ان بے ضمیر سرکاری ملازمین نے، جو عرصے تک اس سے بھتہ وصول کرتے رہے تھے، جن کے اندر کا انسان کب کا مر چکا تھا، اسی وقت وہ ضمیر کا ٹھیلا اٹھا کر یہ کہہ کر لے گئے کہ 10 ہزار روپے دو گے تو یہ ٹھیلا ملے گا، ورنہ بھول جاؤ۔

میرے دوست نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ مگر اس کے بچوں کی بھوک نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔ مکان کا کرایہ، یوٹیلٹی بلز، اسکول کی فیس، بیٹی کی بیماری اور اس کے علاج کیلیے درکار فیس و ادویات کے خرچ نے اس کی کمر توڑ دی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ایک 36 سال کا بندہ 80 سال کا لگ رہا تھا۔ لوگوں سے ادھار لے کر ضمیر نے پھر سے خود کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی تو ہماری حکومت کے عوامی نمائندوں کو یہ بات بھی ناگوار گزری اور جہاں وہ کھڑا ہوتا وہاں آ کر اس سے پیسے وصول کیے جاتے۔ کبھی کوئی آتا سو روپے لے جاتا تو کبھی کوئی افسر بن کر آتا تو دو سو روپے لے جاتا۔ اس بھتہ خوری سے تنگ آ کر اس نے گلی گلی پھیرا لگانے کا ارادہ کیا۔

لیکن بقول ضمیر یہاں بھی اسے عوامی لٹیروں کو کچھ نہ کچھ دینا پڑتا ہے۔ پورا دن سخت محنت مزدوری کر کے جب گھر جاتا ہوں تو بچت کے طور پر میرے ہاتھ میں کبھی سو روپے اور کبھی دو سو روپے ہوتے ہیں۔ جس سے صرف گھر میں دال بڑی مشکل سے بن پاتی ہے۔

اپنے محلات میں بیٹھ کر ہماری حکومت کے عوامی نمائندے صرف اپنی سیاست کو دوام بخشنے کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے۔ الٹا عوام کے سامنے ان کا یہ کہہ کر مذاق اڑاتے ہیں کہ ٹماٹر 17 روپے کلو ہیں۔ یہ مٹھی بھر لوگ بائیس کروڑ عوام کی قسمت کا فیصلہ کرتے ہیں، ان کیلیے پالیسیاں بناتے ہیں۔ جس میں آٹا، گھی، چینی، دالوں پر ٹیکس بڑھا کر کہتے ہیں ہم ہی آپ کے خدمت گار ہیں، ہم ہی جمہوری لوگ ہیں جو جمہور کا خیال رکھتے ہیں۔ ہماری حکومت کے عوامی

نمائندے اپنے ذاتی مفادات کیلیے راتوں رات ہنگامی اجلاس طلب کر کے فیصلے صادر فرما دیتے ہیں۔ یہی عوامی نمائندے اسمبلی میں بیٹھ کر اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہی جمہوریت پسند لوگ سڑکوں پر نکل کر کبھی اس ادارے کو گالیاں دیتے ہیں تو کبھی اُس ادارے کو گالیاں دیتے ہیں۔ یہ سب دکھلاوا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سب ایک ہی حمام میں ننگے ہو کر ہمیں حق حلال کا سبق پڑھاتے ہیں۔ ہمارے نام پر عیاشیاں کرنے والے ہمارے ہی گھر کے چراغ گل کرنے میں مصروف ہیں۔ ہم پر ٹیکس لگا کر اور ہمارے سر سے چھت چھین کر اپنے محلات بنانے اور کاروبار کو عروج پر پہنچانے والے ہمیں کہتے ہیں کہ ملک سے غربت ختم کریں گے۔

ضمیر جیسے لوگ ہر گلی اور چوراہے پر کھڑے نظر آتے ہیں، جن کیلیے ملک میں کوئی پالیسی نہیں بنائی جاتی۔ ان جیسوں کیلیے نہ کبھی کوئی قرض اسکیم لائی گئی اور نہ ہی انہیں کوئی آشیانہ فراہم کیا گیا۔ بلکہ ضمیر جیسے لوگوں کو صرف سیاسی جلسے جلوسوں کیلیے رکھا جاتا ہے۔ جنہیں ہمیشہ یہ آسرا دیا جاتا ہے کہ اقتدار میں آ کر ہم آپ کو نوکری دیں گے، آپ کو گھر دیں گے، آپ کو قرض دیں گے۔ لیکن اقتدار میں آنے کے بعد وہ لوگ صرف اپنے محلات بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور ضمیر جیسے افراد پھر سے سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے اپنے گھر کا چولہا جلانے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ کئی ضمیر وقت اور حالات کے ہاتھوں اس قدر ٹوٹ جاتے ہیں کہ انہیں سمٹنا بہت مشکل ہو جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود کو دنیا پر بوجھ سمجھ کر ہمیشہ کیلیے ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ کچھ ضمیر اپنے جیسوں کو لوٹنے میں مصروف ہو کر مفاد پرست قانون کے ہاتھوں جیل چلے جاتے ہیں اور کچھ ضمیر کسی گولی کا شکار ہو کر دنیا چھوڑ دیتے ہیں۔

میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہے، جسے پڑتی ہے وہ آواز تک نہیں نکال پاتا۔ کہیں پڑھا ہے کہ قبر میں سخت ترین مرحلہ حکمران طبقے کیلیے ہے، جنہیں رب نے اپنی زمین پر حکمرانی بخشی۔ تاہم خدا ترس اور خوف خدا رکھنے والے لوگ اس مرحلے کو با آسانی طے کر لیتے ہیں۔ لیکن کچھ ہمارے حکمرانوں کی طرح کے لوگ ہوتے ہیں جو ہمیشہ ایک تنکے کے جواب میں ہی پھنسے رہتے ہیں۔

خلق خدا کی پکار

گزشتہ دنوں ایک اسٹوری کور کرنے کے سلسلے میں ڈیفنس جانا ہوا۔واپسی پر ہائپر شاپنگ مال سے گزرتے ہوئے ایک اسٹور کی بات ذہن میں آ گئی، جہاں سنا تھا راشن سستا مل رہا ہے۔ یہ سوچ کر ایک بلاگ کے سلسلے میں اس اسٹور کی طرف چل دیا۔اسٹور کے باہر زیادہ رش نہیں تھا، دو چار لوگ ہی موجود تھے جو باری باری گیٹ پر موجود چوکیدار سے معلومات حاصل کر رہے تھے۔

''آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ فارم کب ملے گا؟'' ایک بوڑھے شخص کی کمزوری آواز سن کر میں کچھ لمحے کیلئے پیچھے ہی رک گیا۔بابا کے ساتھ ان کی جواں سالہ بیٹی نقاب والا برقعہ پہنے اپنے بابا کا بازو تھامے کھڑی ہوئی تھی۔اس کی نظر جب مجھ پر پڑی تو اسے کچھ عجیب سا محسوس ہوا۔اس لڑکی کو شاید اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا۔شاید یہی وجہ تھی کہ اس نے اپنے کمزور سے بابا کا بازو تھام رکھا تھا کہ کہیں وہ پھوٹ پھوٹ کر رونہ دے۔

یہ سب چند لمحوں میں ہوا تھا، جسے میں نے نوٹ کرلیا اور فوراً چوکیدار سے انچارج کے بارے میں پوچھا کہ وہ کہاں ملیں گے تاکہ یہاں سے چلا جاؤں اور یہ لوگ اپنی بات چیت جاری رکھ سکیں۔لیکن بابا کی بے بسی انتہا کو چھو رہی تھی۔وہ بس ایک ہی سوال کیے جا رہا تھا ''بیٹا یہ فارم کہاں سے ملے گا، میں بہت دور سے آیا ہوں، اور کیا راشن مجھے ابھی مل سکتا ہے؟ تھوڑی مہربانی کر دو مجھ پر، آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔'' چوکیدار نے آگے سے جواب دیا کہ بابا جی فارم آپ کو پیر کو ہی ملے گا، آپ وہ بھر کر دیں گے تو آپ کے پاس کال آئے گی کہ آ کر راشن لے جاؤ۔ایسے راشن نہیں دیتے۔

چوکیدار بھی اب بیزار ہو رہا تھا۔معلوم نہیں کتنی دیر سے وہ یہاں موجود تھے۔کیوں کہ جب میں یہاں پہنچا تو یہ باپ بیٹی ہی چوکیدار سے بات کر رہے تھے۔باقی لوگ انتظار میں کھڑے تھے۔

چوکیدار کی آواز اونچی تھی اور بابا کا لہجہ انتہائی دھیمہ۔جس سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ اپنی سفید پوشی بھی بچانا چاہ رہا تھا، جو اس وقت تار تار ہو رہی تھی۔اور اس کی بیٹی اپنے بابا کا بازو تھامے انتہائی غم زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔''بابا چلو ناں یہاں سے، چلو ناں بابا''۔یہ آواز بھی کافی دھیمی تھی، جسے چوکیدار شاید ہی سن سکا ہو، مگر چوں کہ میں قریب ہی کھڑا

تھا جسے اس لڑکی نے محسوس کیا اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بابا کی عزت نفس پر کوئی داغ نہیں لگانا چاہ رہی تھی، اس لیے 'چلو ناں بابا پلیز' کے الفاظ دہرائے جا رہی تھی۔

معلوم نہیں کتنی دور سے اور کتنی امید لیے وہ یہاں راشن لینے آئے تھے، لیکن بے بس باپ اس طرح خالی ہاتھ جانا نہیں چاہ رہا تھا، اور بیٹی بابا کی عزت نفس پر کوئی آنچ نہیں آنے دینا چاہ رہی تھی۔ اتنی التجائیں بے کار ثابت ہوئیں اور ان بے بس باپ بیٹی کو مایوس لوٹنا پڑا۔

بے بس باپ کی التجا اور بیٹی کا باپ کی عزت نفس کا خیال، اور چلو ناں بابا کے وہ آخری الفاظ جسے سن کر میری ٹانگوں سے جان نکل چکی تھی۔ کئی بے بس انسانوں کو دیکھ چکا ہوں، کئی مجبور خاندانوں کو آئے روز کسی نہ کسی در پر عزت تار تار کرواتے دیکھتا رہتا ہوں، لیکن اس بے بس لڑکی کی آواز میں بہت درد تھا، جسے چوکیدار نے تو محسوس نہیں کیا، لیکن اس آواز نے جہاں اس باپ کا کلیجہ چھلنی کر دیا ہوگا، وہیں ان الفاظ نے میری دنیا بھی بدل کر رکھ دی تھی۔

'چلو ناں بابا، ابھی یہ کچھ نہیں دیں گے۔ آپ چلو پلیز۔ چلو ناں بابا'۔ یہ آواز میرے کانوں میں گونجتی رہی اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اسٹور منیجر سے ملنے چلا گیا۔ اسٹور منیجر سے ملنے والی معلومات کے مطابق اسٹور میں صرف فارم بھرنے والے لوگوں کو کال کر کے بلایا جاتا ہے۔ 350 روپے کے عوض ایک ہزار روپے کا راشن دیتے ہیں۔ منیجر کے مطابق لوگوں کی بھیڑ اتنی ہوتی ہے کہ ہم کنٹرول نہیں کر سکتے۔ ہر دوسرا شخص محتاج اور زکوٰۃ کا حقدار ہے۔ بے شک اسٹور 630 روپے کی مدد کر رہا ہے۔ ایک نیک کام میں لگا ہوا ہے اور زکوٰۃ سے غریبوں کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن غربت اور بے بسی کا عالم اس سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے۔

سفید پوشی کا بھرم تو پہلے بھی رکھنا مشکل تھا، مگر اب حالات اس نہج پر پہنچ چکے ہیں کہ سفید پوشی کی چادر تار تار ہو کر بہن، بیٹیوں اور ماؤں کے سر سے اتر چکی ہے۔ سفید پوشی کی چادر اب بے بسی کا لبادہ بن کر باپ اور بھائیوں کے گردن چکا ہے۔ غریب کی اس چادر میں بھی اتنے چھید لگ چکے ہیں کہ اسے دوبارہ اپنی اصل حالات میں لانا تقریباً ناممکن ہو چکا ہے۔

کراچی میں گزشتہ دنوں مسجد میں نمازیوں کو لوٹنے کی ویڈیو دیکھ کر پہلے بہت غصہ آیا کہ یہ لوگ جہنمی ہو چکے ہیں جو اللہ کے گھر میں بھی ایسا کام کر رہے ہیں۔ لیکن آج جب ان بے بس باپ اور بیٹی کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی حالات اب نااہل حکمرانوں کے کنٹرول سے باہر جا چکے ہیں۔ جس گھر میں غربت نے اپنے پنجے گاڑ دیے ہوں، جہاں دو وقت کی روٹی میسر نہ ہو، بے روزگاری کی وجہ سے ماحول اذیت بن چکا ہو، مہنگائی آسمان کو چھو رہی ہو، ایسے میں بچوں کی بھوک بھوک کی فریادیں کسی بھی اچھے بھلے انسان کو کسی بھی جرم سے نہیں روک سکتیں۔

ہمارے حکمرانوں کو روز نت نئی کہانیاں بنانا اور میڈیا پر آ کر عوام کا مذاق اڑانے سے فرصت نہیں۔ پاکستان میں کوئی ایسا اخبار نہیں جس کی مین سرخی حکمران جماعت کے نام ہو اور ایسا کوئی نیوز چینل نہیں جس میں صبح سے رات تک حکمرانوں کی

جو نچلے بازیوں کے قصے نہ ہوں۔میڈیا اور حکمرانوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔یہ دونوں ایک دوسرے کی ڈوریں کھینچتے رہتے ہیں۔صبح سے شام تک میڈیا پر ایک سیاسی جنگ کا ماحول نظر آتا ہے۔ان ہی کے قصے کہانیاں ہر چینل کی زینت بن چکے ہیں۔نہ حکمرانوں کو عوام کے مسائل سے کوئی غرض ہے اور نہ میڈیا کو عوام کو درپیش مسائل کی نشاندہی کرنے کی فرصت۔

دھرنے، جلسے، جلوس، احتجاج، یہ سب عوام کو بے وقوف بنانے اور کرسی کے چکر میں کیے جا رہے ہیں۔نہ عوام کا خیال پہلے کسی کو تھا اور نہ اب کسی کو ہے۔میری نظر میں آج تک کوئی احتجاج مہنگائی کے خلاف نہیں کیا گیا۔کوئی دھرنا مہنگائی اور بے روزگاری کے خلاف نہیں دیا گیا۔جس نے بھی احتجاج کیے اور دھرنے دیے اپنے ذاتی مفادات کے تحفظ کیلیے دیے۔

وزیر خزانہ کہتے ہیں ملک میں مہنگائی ہوتی تو ٹماٹر 17 روپے کلو نہ ملتا۔اگلے روز عوام کا مذاق اڑانے میں پیش پیش وفاقی وزیر فردوس عاشق اعوان جس نے مٹر 5 روپے کلو کر دیے۔انہیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ ایک عام آدمی آٹا کتنے روپے کلو خرید رہا ہے۔گھی، تیل، چینی، دالیں کتنے روپے کلو بک رہے ہیں۔ان شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کو یہ معلوم ہے کہ نواز شریف بیمار ہے، فضل الرحمٰن دھرنا چھوڑ کر احتجاج پر اتر آئے ہیں، کرتارپور کتنے بھارتی آئے۔ان باتوں سے عوام کو کبھی غرض نہیں رہی۔شاید یہی وجہ ہے کہ کبھی حکمرانوں کو بھی عوامی مسائل سے غرض نہیں رہی۔آج مہنگائی جس انتہا کو چھو رہی ہے اور بے روزگاری کا سیلاب جس تیزی سے طوفان کی شکل اختیار کر رہا ہے، ایسا لگ رہا ہے کہ عوام کے سینوں میں بننے والا لاوا بہت جلد آتش فشاں کی صورت میں نظر آئے گا، جو ان نااہل حکمرانوں کو تہس نہس کر دے گا۔جس جھوٹی شان وشوکت سے یہ لوگ جی رہے ہیں، وہ وقت اب زیادہ دور نہیں رہا، جب ان کے محلات اور کوٹھیاں ان کے قبرستان بنیں گے۔

یہ ایک چھوٹا سا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے، لیکن ایسے لاکھوں واقعات روزانہ کہیں نہ کہیں رونما ہوتے رہتے ہیں، جہاں بے بسی بھی اپنی بے بسی پر رو دیتی ہے۔خدا کی لاٹھی بے آواز ہے۔امید کرتا ہوں جلد یہ لاٹھی ان لوگوں پر پڑنے والی ہے جو خلق خدا کو ناحق تنگ کرنے اور اپنی عیاشیوں میں مصروف ہیں۔

سرکاری مال مفت کا ہے؟

صحافتی ذمے داریوں کی ادائیگی کیلیے ہر روز کسی نہ کسی سرکاری ادارے میں جانا ہوتا ہے اور وہاں موجود سرکاری گاڑیاں، فرنیچرز، مواصلاتی آلات سمیت کئی قیمتی اشیاء کو دھوپ میں سڑتے دیکھ کر دل جلتا ہے۔ اس معاملے میں ہم کسی ایک حکومت کو مورد الزام نہیں ٹھہرائیں گے، بلکہ تمام حکومتی افسران اس میں برابر کے شریک ہیں۔ سندھ حکومت ہو یا لوکل گورنمنٹ، سب کا حال برا ہے۔ لیکن افسران 'سب اچھا ہے' قرار دینے کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ جب فنڈز کی بات آتی ہے تو پھر سب برا ہو جاتا ہے۔

گزشتہ روز سندھ سیکریٹریٹ جانا ہوا۔ پٹرول پمپ کے پیچھے دو سرکاری پوٹھوہار جیپ دیکھیں جو کئی عرصے سے کسی کے زیر استعمال نہیں، جسے وہاں دھوپ میں لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسی طرح کمشنر ہاؤس میں ایک مرسیڈیز ویگن دھوپ میں کھڑی سڑ رہی ہے۔ ٹاؤن آفس میں سرکاری گاڑیاں دھوپ میں گل سڑ چکی ہیں۔ تھانوں میں ریکوری گئی اور چوری کی وارداتوں میں استعمال ہونے والی گاڑیاں اپنے مالکان کا انتظار کرتے کرتے کباڑ کے لائق بھی نہیں رہیں۔

سندھ گورنمنٹ اور لوکل گورنمنٹ ہر کام میں سب سے پہلے فنڈز کا رونا روتی نظر آتی ہیں، لیکن اپنے مفادات کے سارے کام وقت پر ہو رہے ہیں۔ سرکاری ملازمین کو تنخواہ وقت پر مل رہی ہے، پنشنرز کو پنشن وقت پر مل رہی ہے، افسران کی چائے پانی کے فنڈز وقت پر ریلیز ہو رہے ہیں، آفس کے اخراجات جس میں تمام ضروری اور غیر ضروری چیزیں شامل ہیں، وقت پر مہیا کی جارہی ہیں۔ لیکن عوام کے مسائل آج بھی جوں کے توں ہی ہیں، اس کیلیے فنڈز مہیا نہیں ہو رہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب سرکاری افسران کی ضروریات پوری ہو رہی ہیں تو پھر عوام کی ضروریات کیوں نہیں پوری کی جاتیں؟ عوام اپنا پیٹ کاٹ کر ٹیکس دے رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو بھوکا سلا کر سرکاری ملازمین کے بچوں کو کھانا کھلا رہے ہیں۔ اپنے بچوں کی اچھی تعلیم کا خواب ادھورا چھوڑ کر سرکاری ملازمین کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوا رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کیا یہ عوام کی ذمے داری میں شامل ہے کہ وہ ٹیکس بھی دیں اور سہولیات بھی انہیں نہ ملیں؟

ایک سرکاری ملازم 60 سال کی عمر میں ریٹائرڈ ہوکر آرام کی زندگی گزارتا ہے۔ پیسہ زیادہ ہو تو حج اور عمرے پر بھی نکل جاتا ہے۔ نئے گھر کی تعمیر بھی کراتا ہے اور لان میں بیٹھ کر چائے کی پیالی ہاتھ میں پکڑے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے بیگم سے یہ بھی کہتا ہے کہ ہمارے ملک کو نجانے کس کی نظر لگ گئی ہے، کوئی کام ڈھنگ کا نہیں ہو رہا، ہر جگہ کرپشن، ہر جگہ بدمعاشی، ہر جگہ نفرت کی آگ لگی ہوئی ہے۔ لیکن وہ سرکاری ملازم یہ کیوں بھول جاتا ہے کہ جب ڈیوٹی پر تھا تو اس وقت اس نے کیا کردار ادا کیا؟ کبھی اس نے ایمانداری سے اپنی نوکری کی؟ کبھی اس نے عوام کی دادرسی کی؟ نہیں! ایسا اس نے ہرگز نہیں کیا ہوگا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو شاید ملک کے حالات اس نہج پر نہ پہنچ پاتے جو آج ہیں۔

ایک غریب ساری زندگی کماتا ہے اور جب کمر جھک جاتی ہے تب بھی اپنے پیٹ کی خاطر وہ کہیں نہ کہیں برسرروزگار نظر آتا ہے۔ یہ اس کی بدنصیبی ہے کہ وہ سرکاری ملازم نہیں۔ اگر سرکاری ملازم ہوتا تو شاید وہ بھی آج گھر میں بیٹھ کر آرام سے زندگی گزار رہا ہوتا۔ وطن عزیز میں اس حوالے سے کوئی قانون بھی موجود نہیں کہ اسے گھر بیٹھ کر اتنی رقم ادا کی جائے جس سے وہ اپنی زندگی کے آخری دن بہتر طور پر گزار سکے۔ ای او بی آئی پرائیوٹ ملازمین کو پنشن کی سہولت فراہم کرتا ہے، مگر وہ بھی اس شرط پر کہ ملازم کی درخواست ادارے کی طرف سے آئے گی، اور ادارہ ہی اسے اس سسٹم میں داخل کرا سکتا ہے۔ لیکن آج کے ادارے اس کا فائدہ اپنے ملازمین کو دینے کو تیار نہیں۔ اس کی وجہ جہاں ٹیکسز کا ڈر ہے، وہیں ملازمین کی جبری برطرفیاں بھی ہیں۔

گورنمنٹ اپنے افسران کو گاڑی، گھر، فیول اور نجانے کیا کیا سہولتیں عوام کے ٹیکس سے دے رہی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ فری کے مال کی کبھی اہمیت نہیں ہوتی۔ اگر یہ گاڑیاں انہیں ان کی ذاتی تنخواہ سے کٹوتی کی بدولت ملتیں تو اسے وہ اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتے۔ لیکن یہ عوام کا مال تھا، جسے تپتی دھوپ میں گلنے سڑنے کیلئے چھوڑ دیا جاتا ہے اور پھر نئی گاڑی کی درخواست جاتی ہے اور پھر نئی گاڑی کا حشر بھی پہلے والی گاڑی جیسا ہو جاتا ہے۔ سونے پر سہاگہ کہ ان گلی سڑی گاڑیوں کا فیول ہر ماہ عوام کے ٹیکس سے ادا ہو رہا ہے۔ ان گاڑیوں کو اس قابل بھی نہیں چھوڑا جاتا کہ وہ نیلام کی جائیں اور کسی دوسرے کے استعمال میں آسکیں۔

حکومتیں اپنی عیاشیاں کم کریں تو انہیں دوسرے ذرائع بھی نظر آئیں کہ کہاں سے پیسہ حاصل کیا جا سکتا ہے؟ ایک آسان اور سادہ سا حل صرف ٹیکس ہے، جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ حکومتیں چاہیں تو ایسی گاڑیوں، فرنیچر اور دیگر قیمتی اشیا کی لسٹ تیار کریں، جو ان کے استعمال میں نہیں اور انہیں ایک آسان طریقے سے، جو ہر شخص کی دسترس میں ہو، نیلام کر دیں۔ اس سے ایک تو ضرورت مند کی ضرورت پوری ہو جائے گی اور حکومتوں کو اس سلسلے میں ایک بھاری رقم بھی مل جائے گی۔ دھوپ میں سڑنے اور گلنے کیلئے چھوڑنے سے بہتر یہ ایک بہتر حل ہے۔

اس سلسلے میں حکومتیں ایک ایپ تیار کریں اور ہر روز وہاں ایسی چیزیں ڈالی جائیں جو اب ان کے زیر استعمال نہیں رہیں۔ ان اشیا کی فہرست اور اشیا کے سامنے اس کی قیمتیں بھی لکھی جائیں، تاکہ خریدار کو اس سلسلے میں کسی قسم کی کوئی

پریشانی بھی نہ ہو۔رقم وصولی کیلیے بھی اسی ایپ میں سرکاری اکاؤنٹ نمبر دیا جائے، جس سے رقم ڈائریکٹ حکومت کے اکاؤنٹ میں چلی جائے۔اس سے کسی قسم کی کرپشن کا اندیشہ بھی نہیں رہے گا اور نہ ہی کسی شخص کو سرکاری پیچیدہ معاملات میں پڑنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

دنیا جدید سے جدید تر ہوتی جارہی ہے، لیکن ہم آج بھی پیچیدہ اور ضرورت سے زیادہ کاغذات کے استعمال میں لگے ہوئے ہیں۔کبھی فلاں آفیسر کے سائن تو کبھی فلاں آفیسر کی منتیں کرنی پڑتی ہیں۔اپنے جائز کام کیلیے لوگوں کو ہزاروں اور لاکھوں روپے رشوت ادا کرنی پڑتی ہے۔اگر حکومتیں کرپشن کے خاتمے میں سنجیدہ ہیں تو کم سے کم آج کی ٹیکنالوجی کا فائدہ اٹھا کر اس لعنت سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔اس میں صرف سرکاری اشیا ہی فروخت کیلیے نہ دی جائیں بلکہ اس طرح کی دیگر ایپ بنا کر ٹرانسفرز آرڈر، تعیناتی آرڈرز، میرٹ پر بھرتیاں، ٹیسٹ کی سہولت، دکانوں پر لگائے ٹیکس کی وصولی بھی ان ایپس کے ذریعے ہو سکتی ہے۔اس میں حکومت کو کوئی پریشانی بھی نہیں ہوگی اور ساتھ ہی بے تحاشا سرکاری امور کی انجام دہی میں اس طرح کی ایپ کا استعمال کرکے جہاں ایک طرف عوامی مشکلات کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے، وہیں اس سے ملک میں کرپشن کا خاتمہ بھی ممکن ہو سکے گا، ساتھ ہی عوام بھی راشی افسران کی بدمعاشیوں سے آزاد ہو سکیں گے۔فیس ڈائریکٹ سرکاری اکاؤنٹ میں آئیں گی تو اس سے حکومتوں کا رونا بھی بند ہو جائے گا۔

تاہم یہ دیوانے کا ایسا خواب ہے جس کی تعبیر ہزاروں سال بعد بھی کم سے کم پاکستان میں تو ممکن نہیں۔البتہ مستقبل میں اگر کوئی حقیقی عوامی نمائندہ وزیراعظم یا وزیراعلیٰ کی سیٹ پر پہنچ گیا تو پھر شاید یہ کام ممکن ہو جائے۔ورنہ خواب دیکھنے پر پابندی تو نہیں۔

سیاسی ڈرامے بازیاں

طالب علمی کے زمانے میں ہر 14 اگست کی آمد سے قبل ہی اس کی بھرپور تیاریاں عروج پر پہنچ جایا کرتی تھیں۔ تمام طلبا ہر وقت کچھ نیا کرنے کی جستجو میں لگے رہتے تھے۔ جشن آزادی سے قبل ہی طلبا قومی پرچم کے لباس زیب تن کیے اسکول جانا شروع کر دیتے، جن کے سینے پر چاند تارا کا بیج بھی ہوا کرتا تھا۔ یکم اگست سے ہی ہماری بھرپور کوشش ہوتی تھی کہ آرمی سلوگن پیش کیا جائے کہ کس طرح ہمارے جوانوں نے وطن عزیز کیلئے قربانیاں دیں اور دے رہے ہیں۔

ہمارے قابل محترم اساتذہ بھی ہمارے ساتھ لمحہ بہ لمحہ ہماری رہنمائی کیلئے ساتھ ہوا کرتے تھے۔ کوئی میجر عزیز بھٹی شہید کا رول پلے کرنے کی تیاری کر رہا ہوتا تو کوئی راشد منہاس شہید کے کردار میں خود کو ڈھالنے کی مشق میں مصروف نظر آتا۔ اسکاوٹ پیریڈ کے دوران بھی ہمیں جنگی ماحول جیسے کردار ادا کرائے جاتے اور انہی پر ہمیں ٹریننگ دی جاتی۔ یہ تمام باتیں سرکاری اسکول کی ہیں، جہاں سے ہم نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔

ہمارے اساتذہ ہمیں ہر وقت ایک ہی چیز باور کرایا کرتے تھے کہ بڑے ہو کر فوج میں جانا تا کہ جس ملک نے تمہیں پہچان دی ہے تم اس کیلئے اپنا آپ قربان کر دو۔ اساتذہ کی باتیں اور پی ٹی وی پر چلنے والے فوجی کرداروں پر مشتمل ڈراموں، جن میں سرفہرست 'الفا، براوو، چارلی'، 'دھواں' اور پاک فوج کے شہداؤں کے نام سے منسوب ڈرامے دیکھ کر ہمارا جذبہ وطن عزیز اور خاص کر پاک فوج کیلئے انتہا کو چھو جاتا تھا۔ تاہم آج سرکاری اسکولوں کا تو حال ہی مت پوچھیے، رہی سہی کسر پرائیوٹ اسکولوں نے پوری کر دی ہے۔ جہاں پاک فوج سے متعلق تو دور، وطن عزیز کیلئے قربان ہونے کی بات بھی نہیں کی جاتی۔

گزشتہ جشن آزادی پر ایک اسکول کی تقریب میں جانا ہوا، جہاں ڈانس پارٹی کے سوا بچوں کو کچھ نہیں سکھایا گیا۔ ایک دو نیشنل تھیم پر صرف ٹیبلو پیش کیا گیا، جب کہ اسکاوٹ پیریڈ تو اب تمام اسکولوں سے بالکل ہی ختم ہو چکا ہے۔

چیئرمین سینیٹ کے انتخابات میں حاصل بزنجو کا میڈیا کے سامنے آئی ایس آئی کو برا بھلا کہنا جہاں ایک طرف انتہائی ناگوار گزرا، وہیں میڈیا پر اسے مزید پیچیدہ اور توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح ؒ نے فرمایا تھا کہ پاک

فوج ہماری دفاع کی آخری لکیر ہے۔انٹیلی جنس ادارے آئی ایس آئی کے قیام کے بعد جس تیزی اور بھرپور کارکردگی سے اس نے پوری دنیا میں اپنا سکہ جمایا، وہیں ہمیشہ سے اسے ملک کے اندر ہی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔دنیا آئی ایس آئی کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔اور ہم اپنے ہی ہوکرنیشن پر بجلی گرانے سے باز نہیں آتے۔ہمارے بچوں کے دماغ میں جہاں پاک فوج کیلئے زہر ڈالا جا رہا ہے، وہیں آئی ایس آئی سے بھی نفرت کرنے پر اکسایا جا رہا ہے۔ہم اپنے دفاع کو خود اپنے ہاتھوں سے کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے حکمران ہیں، جنہوں نے اپنے سیاسی روزگار کیلئے ہر برے کام میں ملوث ہونے کا بھرپور ثبوت دیا، لیکن الزام ہمیشہ پاک فوج پر لگایا۔مانتا ہوں پاک آرمی کوئی فرشتوں کی جماعت نہیں اور نہ ہی اس میں سارے فرشتے بھرتی کیے گئے ہیں۔وقت پڑنے پر آسمانی فرشتوں کی جماعت ہمیشہ ان پر اپنا سایہ بنا کر چلتی ہے۔ہماری فوج کو برا کس نے بنایا؟ کس نے انہیں سیاست میں لانے کی سوچ کو پروان چڑھایا؟ کس نے آئی ایس آئی کا سہارا لے کر حکومت کے مزے لوٹے؟ آئی ایس آئی کے سامنے اپنے ضمیر کو کس نے فروخت کیا؟ آج یہ لوگ آئی ایس آئی کو برا بھلا کس منہ سے کہہ رہے ہیں جن کی پارٹی کے قائدین کسی دور میں ان ہی کی گود میں بیٹھ کر اپنے دشمنوں کو ڈرا دھمکا کر اپنا مقصد پورا کرتے تھے۔

کسی ایک کے گناہ کی سزا تو پورے گھر والوں کو بھی نہیں دی جاتی، مگر یہاں تو بساط ہی الٹی چلتی آ رہی ہے۔کسی جنرل نے اگر ان کا ساتھ نہیں دیا تو پوری فوج کو بدنام کردو۔کسی آئی ایس آئی افسر نے ان کو لفٹ نہیں کرائی تو پورے ادارے کو بدنام کردو۔موجودہ صورت حال میں صرف یہ ہی نظر آتا ہے کہ تمام کام فوج کے ذمے ڈال کر خود بری ہو جاؤ۔اگر کچھ دیر کیلئے مان لیا جائے کہ پس پردہ فوج ہی ملک کو چلا رہی ہے تو پھر آپ لوگ کیوں عوام کو بے وقوف بنانے پر تلے ہوئے ہو۔آپ اپنی سیاسی ڈرامے بازیوں سے جہاں عوام کو لوٹنے میں مصروف ہو، وہیں سارا ملبہ فوج پر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دے رہے ہو؟

ہمارے سیاست دانوں سے ہماری نسلیں سیکھتی ہیں اور جو کچھ آج کل ہمارے حکمران ٹی وی اور اخبارات میں بیانات دے رہے ہیں اس سے ہماری آنے والی نسلیں جو سیکھ رہی ہیں وہ پاکستان کے مستقبل کیلئے انتہائی خطرناک ثابت ہونے والا ہے۔ہم اپنی دفاع کی آخری لکیر کو پار کرنے کی آخری حدوں کو چھو رہے ہیں۔ہم پاکستان کو مضبوط بنانے کے بجائے کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔اور یہ سب دشمن کی ایما پر کیا جا رہا ہے۔

بھلا ایک سبزی فروش، نان بائی، گل فروش اور ٹھیلے والا ملک کو کمزور کرنے کی صلاحیت کیسے رکھ سکتا ہے؟ اول تو اس کے پاس وسائل نہیں اور دوسری اہم بات حکمرانوں نے انہیں اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ وہ دو وقت کی روٹی کے چکر سے آزاد ہو سکیں۔انہیں تو صرف مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے۔لیکن اگر اسی سبزی فروش، نان بائی، گل فروش اور ٹھیلے والے کے دل میں آئی ایس آئی اور پاک فوج کے خلاف زہر بھر دیا جائے تو اس کی آنے والی نسل بھی اس سے نفرت کرنے لگے

گی ۔اکثر باپ کی نفرت کو بیٹا ہی پروان چڑھاتا نظر آیا ہے،اور یہ سب کچھ اس وقت ملک میں ہو رہا ہے ۔
ان سیاسی ڈرامے بازوں کی اپنی اولاد یورپ میں پل رہی ہے اور وہیں سے پڑھائی مکمل کرنے کے بعد باپ کی پکی نوکری انہیں تھالی میں رکھ کر پیش کی جاتی ہے ۔جب یہ لوگ باہر سے پڑھ لکھ کر آئیں گے تو وہاں کی وفاداری ان کے لیے زیادہ اہم ہوتی ہے ۔ایسے میں آپ ان سے کس طرح خیر کی توقع کرسکتے ہیں ۔ایک دن انہیں سپاہی کا کردار ادا کرنے کا کہا جائے تو ان کی ساری اکڑ ختم ہو جائے ۔
ہمارا ایک،ایک سپاہی ملک و قوم کیلئے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سرحدوں کی حفاظت میں دن رات مصروف ہے،اور ہم راتوں کو سکون سے ٹی وی پر بیٹھ کر ان کی برائیاں کرنے میں زمین و آسمان ایک کر دیتے ہیں ۔ہمارے سیاسی ڈرامے باز یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ جنگیں فوج ہی لڑتی ہیں اور اگر فوج کمزور ہوگی تو کیا وہ خاک آپ کی حفاظت کرے گی؟
ان سیاسی ڈرامے بازوں کو اگر ذرا سی بھی شرم ہو تو وہ فوری اپنی سیکیورٹی پر مامور جانثاروں کو واپس اپنی اپنی پوزیشن پر جانے کا آرڈر دے دیں ۔لیکن یہ لوگ ایسا نہیں کریں گے،کیوں کہ یہ لوگ مرنے سے بھی بہت ڈرتے ہیں،انہیں اپنی جان بھی بہت عزیز ہے ۔
سیاسی ڈرامے بازوں کیلئے صرف اتنا ہی کہوں گا کہ نسلوں کو برباد کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور نہ ہی آئی ایس آئی کو برا بھلا کہنے سے کچھ ہوگا ۔پاکستان تا قیامت قائم رہنے کیلئے وجود میں آیا ہے،لیکن اتنا ضرور ہے کہ تم قیامت تک جی نہیں سکو گے،بلکہ تاریخ کے صفحات پر عبرت کا نشان بن کر رہو گے ۔اس لیے گزارش ہے کہ پاکستان سے جھوٹی محبت کا بھرم رکھنے کیلئے پاک فوج اور آئی ایس آئی کو گندا کرنے سے پرہیز کیجئے،کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتاوے کا موقع بھی نہ مل سکے ۔

ظلم کی ریاست؟

گزشتہ دنوں کراچی کے مختلف علاقوں میں ٹھیلے اور پتھارے والوں کے خلاف بھرپور آپریشن کیا گیا۔ جہاں جہاں ٹھیلے اور پتھارے نظر آئے انہیں اٹھا کر لے جایا گیا اور 5 ہزار روپے رشوت کے عوض چھوڑا گیا۔ ضبط ہوا مال بھی واپس نہیں کیا گیا۔ اس آپریشن کے بعد ان گلی محلوں کی مارکیٹیں تو کشادہ ہوگئیں، مگر ساتھ ہی ان مارکیٹوں میں ویرانی بھی چھا گئی۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے والے لوگ ان ہی ٹھیلے اور پتھاروں سے اپنی ضروریات زندگی پوری کر رہے تھے۔ کیوں کہ انہیں دکان کا کرایہ ادا نہیں کرنا ہوتا (سوائے بھتے کے) اور سبزی و دیگر اشیائے خورونوش بھی سستے داموں مل جایا کرتی تھیں۔ جس سے دونوں طبقات اپنی زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہے تھے۔

تبدیلی سرکار کا بجٹ جس طرح امیروں کو پسند نہیں آیا، وہیں غریب کی تو جان ہی لے گیا۔ عوام بے روزگاری اور مہنگائی سے پہلے ہی مرے جا رہے تھے۔ رہی سہی کسر اشیائے خورونوش پر ٹیکس کی بھرمار نے پوری کردی۔ جس سے غریب آدمی زندہ لاش بن چکا ہے۔ تبدیلی کے دعوے اور ریاست مدینہ کے خواب دکھا کر ووٹ مانگنے والوں نے مملکت خداداد کو ظلم کی ریاست میں تبدیل کردیا۔ 6 ماہ میں سب کچھ بہتری کے دعوے اپنی جگہ، لیکن عوام کی حالت بد سے بدتر کرنے میں حکومت نے پوری ایمانداری سے کام لیا۔

وزیراعظم ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر قوم سے لطایہ مذاق بھی کرتے رہتے ہیں کہ بس تھوڑی سی مشکلات ہیں، جس کا ہمیں صبر اور ہمت سے مقابلہ کرنا ہوگا۔ لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک غریب، جس کی تنخواہ 15 سے 20 ہزار روپے ماہانہ ہو، وہ کس طرح اپنے اخراجات کنٹرول کرے۔ آٹا 48 روپے فی کلو فروخت ہو رہا ہے۔ صرف سوکھی روٹی بھی کھائے تو بھی وہ بیس ہزار روپے میں مہینہ نہیں گزار سکتا۔

جس تیزی سے ڈالر اوپر جا رہا ہے، اتنی ہی تیزی سے مکان کے کرائے بھی بڑھائے جا رہے ہیں۔ جنہیں روکنے اور پوچھنے والا ملک میں کوئی نہیں۔ صاحب حیثیت لوگوں نے اپنا سرمایہ اب کسی اور کام میں انویسٹ کرنے کے بجائے

پراپرٹی کے کاموں میں لگا رکھا ہے۔ دو تین بلڈنگ بنا کر ان سے وہ ماہانہ لاکھوں روپے کرایہ وصول کر رہے ہیں۔ جس کا کوئی حساب کتاب نہیں ہوتا۔

وزیراعظم کا سارا دھیان اس طرف ہے کہ ٹیکس کہاں کہاں سے لینا ہے؟ مگر اس پر کسی کا دھیان نہیں جا رہا کہ ایک غریب سے مالک مکان کتنا کرایہ وصول کر رہا ہے اور وہ کس طرح امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے؟

کچی آبادیوں میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے سرمایہ کار ماہانہ اربوں روپے وصول کر رہے ہیں اور یہ سب پیسہ کیش میں وصول کیا جاتا ہے، جو بعد ازاں تجوریوں کی نذر ہو رہا ہے۔ ایسے میں کیسے اور کس طرح معلوم ہوگا کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ ایک شخص نے ایک بلڈنگ اپنے نام کر رکھی ہے، جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس بلڈنگ میں اس کی فیملی رہائش پذیر ہے۔ رہائشی عمارت پر کوئی ٹیکس بھی نہیں۔ ساتھ ہی اس شخص نے چار پانچ بلڈنگیں اپنے بچوں کے نام کر رکھی ہیں، جس سے وہ ماہانہ کرایہ وصول کر رہا ہے۔ ایک عیاشی والی زندگی گزاری جا رہی ہے، لیکن ٹیکس کے نام پر کچھ بھی نہیں نکلتا۔ تاہم غریب ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونے کے باوجود ہر چیز پر ٹیکس دینے کا پابند ہے۔

ہمارے وزیراعظم ہر تقریر میں یورپ کی مثالیں دینے کے عادی ہیں، لیکن اس طرح کے قوانین کب بنائے جائیں گے جو یورپ میں ہیں؟ کرایہ داری ایکٹ پر آج تک عمل نہیں ہو سکا تو باقی معاملات پر کیا امیدیں وابستہ رکھیں۔ پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں نے غربت سے تنگ آ کر جب اپنی روزی روٹی ٹھیلے اور پتھارے کے ذریعے حاصل کرنا شروع کی تو یہ بھی مدینہ کی ریاست کے امیر کو پسند نہیں آیا کہ وہ روزانہ 3 سے 5 سو روپے منافع کیوں کما رہا ہے۔ اس لیے اس سلسلے کو بھی جرم قرار دے کر بند کر دیا گیا۔

سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایک پتھارے والا کتنا کما لیتا ہوگا جس پر ٹیکس لگانے اور بلاوجہ گلی محلوں سے ہٹایا جا رہا ہے؟ 5 سو روپے روزانہ بھی اگر وہ کما رہا ہے تو یہ ماہانہ 15 ہزار بنتے ہیں۔ کیا وہ 15 ہزار روپے ماہانہ سے اپنا گھر چلا سکتا ہے؟ اگر چلا سکتا ہے تو برائے مہربانی ہمیں بھی وہ ترکیب بتا دیں تاکہ ہم بھی اس پر عمل کر کے اپنا گھر چلا سکیں۔

وزیراعظم صاحب آپ فوج کی تعریف کرتے نہیں تھکتے کہ انہوں نے بجٹ میں اضافہ نہ لے کر جہاں حب الوطنی کا اظہار کیا، وہیں قوم پر احسان بھی کیا۔ مگر یہ بھی دیکھ لیں کہ بجٹ میں اضافہ نہ کرنے کے باوجود عوام کو کیا ملا؟ وہ تو پہلے سے زیادہ مہنگائی اور بے روزگاری کے اژدھے سے ڈسے جا رہے ہیں۔

آپ کو پریشانی بھی اگر دکھائی دیتی ہے تو وہ بھی صرف سرکاری ملازمین کی۔ اگر ملازمین کا موازنہ ایک عام آدمی سے کیا جائے تو سرکاری ملازمین کے پاس پکی نوکری ہے۔ وہ اگر دفتر نہ بھی جائے تو بھی اسے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ مل جاتی ہے۔ پھر سالانہ 10 اور 20 فیصد اضافہ الگ کیا جاتا ہے۔ ہاؤس رینٹ اور فیول کی مد میں بھی الگ سے پیسے ملتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ پر گریجویٹی اور بعد میں پینشن کا سلسلہ الگ سے ہوتا ہے۔ لیکن ایک غریب محنت کش کو کیا ملتا ہے؟ وہ جب تک زندہ رہتا ہے اسے محنت کر کے دو وقت کی روٹی کھانی پڑتی ہے لیکن سرکاری ملازمین کے ساتھ ایسا

نہیں ۔سرکاری ملازم 60 سال کی عمر میں ریٹائر ہوکرایک اچھی زندگی گزار رہا ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ملک کی خدمت صرف سرکاری ملازمین کررہے ہیں؟باقی عوام نہیں؟ آپ کے لوگ بجٹ بناتے وقت بھی اگر کسی کا خیال کرتے ہیں تو صرف اور صرف سرکاری ملازمین کا ہی کرتے ہیں ۔کیوں کہ وہ خود سرکاری ملازمین جو ہیں ۔لیکن کسی فیکٹری میں دیہاڑی پر کام کرنے والے کا بجٹ میں کبھی احساس نہیں کیا گیا۔ حکومت نے کبھی اس کے گھر کے چولہے کے بارے میں بجٹ میں کچھ سوچا؟ کیا کبھی کسی ٹھیلے والے یا ریڑھی والے کے بارے میں بجٹ میں کچھ رکھا گیا؟ مدینہ کی ریاست کا کہہ کر ظلم اور کفر کی ریاست میں عوام کو جھونکنے والی حکومت ان سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہے۔

عمران خان صاحب! جب آپ وزیراعظم کی سیٹ پر نہیں بیٹھے تھے، تب آپ کہا کرتے تھے کہ وی آئی پی پروٹوکول نے ملک کا بیڑا غرق کردیا ہے، اشرافیہ ملک کو کھا گئی ہے، ہم ایسا نظام لائیں گے جس سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوں گے۔کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ جب ڈالر اوپر جائے اور پٹرول کی قیمتیں بڑھیں اور قرضے بڑھیں تو سمجھ لینا آپ کا حکمران چور ہے ۔تو کیا اب ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا موجودہ حکمران بھی چور ہے ۔اس نے ہمارے ووٹ پر ڈاکا ڈالا۔ ہمیں سنہری خواب دکھا کر مہنگائی اور بے روزگاری کے دلدل میں مزید دھکیل دیا؟

چلیں سب باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں ،صرف یہ ہی بتادیں کہ وہ پیسہ کہاں گیا جو آپ باہر سے لارہے تھے؟ یہ بھی بتادیں کہ وہ سستے 50 لاکھ مکان کہاں گئے؟ وہ ایک کروڑ نوکریاں کہاں گئیں؟ وہ پانی دینے کا وعدہ کہاں گیا؟ ڈیم بنانے کی باتیں بھی یاد ہیں یا نہیں؟ چلیں ان سب کو بھی تھوڑی دیر کیلیے ایک طرف رکھ دیتے ہیں ۔کم ازکم یہ ہی بتادیں کہ ایک غریب کا چولہا پندرہ ،بیس ہزار میں کیسے چل سکتا ہے؟ ان پڑھ شخص کیلیے گورنمنٹ کے پاس کیا پالیسی ہے؟ اسے کس طرح کا روزگار ملے گا؟ کیا مدینہ کی ریاست میں ایک مڈل پاس کو 50 ہزار روپے کی نوکری مل سکتی ہے؟ کیا مدینہ کی ریاست میں کسی بیوہ کی ماہانہ کفالت کا بندوبست بھی ہے یا نہیں؟ اگر آپ یہ کہیں گے کہ اس کیلیے بیت المال ہے تو پھر صرف یہ ہی کہا جا سکتا ہے افسوس آپ اپنے سرکاری ملازمین کی رشوت خوری سے واقف نہیں ۔یا پھر ان کی بے ایمانی آپ کو نظر نہیں آتی ۔بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے کارڈ بھی صاحب حیثیت لوگوں کے پاس ہی دیکھے گئے ہیں ۔

وزیراعظم صاحب! آخر میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ غریب سے جینے کا حق مت چھینیے ۔غریب کی آہ میں بہت اثر ہوتا ہے ۔آپ کے ساتھ اور آپ کے نیچے کام کرنے والوں کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں ۔اگر ہوتا تو کم ازکم ملک میں غریب کیلیے بھی کوئی قانون ضرور ہوتا۔

فرحان کی موت کا ذمے دار کون؟

نیو کراچی گودھرا کیمپ کا رہائشی 10 سالہ فرحان اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ خوشی خوشی گھر سے نکلا تھا۔ ذہن میں بس ایک دھن سوار تھی کہ سمندر میں نہانا ہے اور مستی کرنی ہے،، بہن بھائیوں پر خوب پانی پھینکنا ہے اور ہلہ گلہ کرنا ہے۔

ساحل پر کی جانے والی شرارتیں واپس آکر اپنے دوستوں کو بھی مزے لے لے کر سنانے کا پلان بھی بنایا ہوگا۔ کچھ اس طرح کے خیالات ذہن میں رکھ کر فرحان اپنے بہن بھائیوں کا ہاتھ تھامے گھر سے نکلا ہوگا، مگر اسے اور اس کے گھر والوں کو کیا معلوم تھا حافظ فرحان کی یہ تفریح اس کی زندگی کی آخری تفریح ہوگی۔ ساحل پر چلنے والی گوکارٹ اس کی جان لے لی گی اور اس کے بہن بھائی فرحان سے ہمیشہ کیلیے بچھڑ جائیں گے۔ والدین نے فرحان کو لے کر بہت سے خواب آنکھوں میں سجائے ہوں گے کہ بڑا ہو کر یہ ہمارا سہارا بنے گا۔ مگر ان بدنصیبوں کو کیا معلوم تھا سہارا بننے سے پہلے ہی فرحان کو کندھا نصیب ہو جائے گا۔

دنیا کے کسی بھی ساحل پر نظر ڈالی جائے تو کہیں بھی گوکارٹ کا تصور نظر نہیں آئے گا۔ اس قسم کی تفریح صرف اور صرف چند روپوں کیلیے کراچی جیسے نام نہاد میگاسٹی میں ہی نظر آئیں گی۔ کبھی غیر معیاری جھولے کسی کی جان لے لیتے ہیں، تو کہیں نام نہاد میگاسٹی کا بے ڈھنگ ٹرانسپورٹ نظام خاندان کے خاندان اجاڑنے میں مصروف ہے۔

میگاسٹی کراچی کی پولیس اپنے طور پر امیر سے امیر تر ہوتی جارہی ہے، جنہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے۔ انہیں صرف اپنی اندھی کمائی سے غرض ہے۔ کچھ اسی طرح مختلف ادارے بھی اس شہر پر قبضہ کرکے اسے اپنی جاگیر گردانتے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن بھی ہے، جس نے کمائی کا کوئی ذریعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ مزار پر غنڈہ ٹیکس پارکنگ کے نام پر وصول کیا جارہا ہے تو ساحل پر مختلف جگہوں پر ڈنڈے لگا کر اور ڈنڈا بردار بٹھا کر ان سے غیر قانونی طور پر پارکنگ، پارکس اور دیگر فیس وصول کی جارہی ہے۔ ساحل پر تجاوزات قائم کر کے اسے قانونی شکل دے کر ٹھیلے والوں کو بسا دیا گیا ہے اور کہیں غیر قانونی معاہدے کر کے مضر صحت اشیا کے ڈھابے بنا کر دے دیے ہیں، جہاں فوڈ اتھارٹی جیسے ادارے کا بھی کوئی نام ونشان نظر نہیں آتا۔

گوکارٹ کو ایک معاہدے کے تحت ساحل پر آنے کی اجازت دی گئی ہے۔ لازماً اس معاہدے کے پیچھے بھی ایک بھاری رقم کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن کے کھاتے میں جارہی ہوگی۔ معلوم نہیں اس معاہدے میں کیا درج ہے، مگر اتنا ضرور ہے کہ اس معاہدے میں یہ ضرور لکھا ہوگا کہ کسی جانی نقصان کی صورت میں انتظامیہ ذمے دار نہیں ہوگی۔ یہ تحریر معاہدے میں سب سے اوپر لکھی ہوگی تاکہ جب بھی کوئی اس طرح کا حادثہ ہو تو فوری طور پر قانونی طریقے سے خود کو بچایا جاسکے۔

گوکارٹ کراچی کے ساحل کے سوا دنیا میں کسی بھی ساحل پر نظر نہیں آئے گی۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں، جن میں ایک یہ کہ لوگ گاڑیوں اور شور شرابے سے دور اور کچھ پل سکون کے گزارنے کیلیے ساحلوں کا رخ کرتے ہیں۔ ایسے میں ان ممالک کا قانون انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی شخص کسی کی پرائیویسی اور آرام میں خلل ڈالے۔

لیکن کراچی میں ان تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھا گیا ہے۔ تفریحی جگہوں پر ایسی ایسی بے ڈھنگ چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں جن سے ایک طرف سکون برباد ہوتا ہے تو دوسری طرف جان کے ضیاع کا بھی اندیشہ لگا رہتا ہے۔

ایس پی کلفٹن سہوائے عزیز کو اس حوالے سے پہلے بھی مطلع کیا جاچکا ہے کہ گوکارٹ کے ڈرائیورز جہاں بغیر لائسنس کے گاڑی چلا کر دوسروں کیلیے نقصان کا باعث بن رہے ہیں، وہیں سکون میں خلل ڈالنے میں مصروف ہیں۔ ان کی بدتمیزی اور بےہودگی کے باعث شریف آدمی ساحل پر جانا پسند نہیں کرتے۔ مگر افسوس کہ ان کے جواب نے ہمارے چودہ طبق روشن کردیے تھے۔ سہوائے عزیز کا کہنا تھا کہ انہیں روکنا ہمارا کام نہیں، اور نہ ہی یہ ہمارے ذمے کا کام ہے، ان کے خلاف کارروائی کا حق صرف ٹریفک پولیس کی ذمے داری ہے۔ ہمارا کام صرف کرائم کو ہونے سے روکنا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہاں پر ٹریفک پولیس کا کیا کام؟ اگر مان لیا جائے کہ یہ کام ٹریفک پولیس کا ہے تو پھر آج تک ٹریفک پولیس ساحل پر نظر کیوں نہیں آئی؟ پولیس ڈائریکٹری میں کہیں بھی اس حوالے سے کسی بھی چوکی یا کسی بھی اہلکار کی تعیناتی کا ذکر نہیں۔ ساحل پر ٹریفک کنٹرول کرنے کا کہیں بھی قانون میں ذکر نہیں۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ ساحل پر کسی بھی قسم کی گاڑی چلانا ممنوع ہے۔ اس لیے نوٹریفک زون میں کسی ٹریفک پولیس اہلکار کی تعیناتی بلاوجہ ہوگی۔

اگر یہ کام ٹریفک پولیس کا تھا تو پھر حادثے کے وقت ٹریفک پولیس کہاں تھی؟ اور اس نے اپنا کیا کردار ادا کیا؟ ایس پی سہوائے عزیز کو شاید یہ بات بھی اب جاکر معلوم ہوئی ہوگی کہ اس گوکارٹ کا کوئی معاہدہ بھی ہوا ہے، جس کے بنیادی نکات بھی اب جاکر چیک کیے جارہے ہیں کہ آخر اس معاہدے میں کیا لکھا ہے۔

اس سے قبل کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن سے کیوں معلومات حاصل نہیں کی گئی؟ کیا پولیس ڈپارٹمنٹ کو ساحل پر یہ گوکارٹ پہلی مرتبہ نظر آئی تھی؟

ہزاروں شہری روزانہ ساحل سمندر کا رخ کرتے ہیں اور ان کی جان و مال کی حفاظت کی ذمے داری پولیس ڈپارٹمنٹ پر

عائد ہوتی ہے۔ایسے میں کنٹونمنٹ کی طرف سے کیا جانے والا غیر قانونی معاہدہ پولیس کی نظروں سے کیوں اوجھل رکھا گیا؟ کیا اس سے کنٹونمنٹ بورڈ کو اپنی غیر قانونی آمدن کا راز کھل کر سامنے آنے کا ڈر تھا؟ اس طرح کے کئی اور سوالات ہیں جو جواب طلب ہیں۔

فرحان کا حادثہ پہلا نہیں، اس سے قبل بھی کئی بچے، بوڑھے اور خواتین گو کارٹ کے باعث حادثوں کا شکار ہو چکے ہیں۔ مگر پولیس محض رسمی کارروائی کر کے معاملہ رفع دفع کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتی رہی ہے۔ساحل پر موجود پولیس اہلکار کبھی کبھار ہی نظر آتے ہیں، زیادہ تر پولیس اہلکار وہاں نظر آتے ہیں جہاں صرف ''جوڑے'' موجود ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی اصل کمائی کا ذریعہ وہی لوگ ہیں یا پھر ساحل پر قائم کی گئی تجاوزات کے بدلے اپنی جیبیں گرم کرتے نظر آتے ہیں۔

کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن نے آمدن کے کئی ذرائع تو بنا رکھے ہیں، مگر سہولیات کے نام پر صرف عوام کو بے وقوف ہی بنایا جا رہا ہے۔ساحل پر آنے سے پہلے پارکنگ فیس ادا کرنا لازمی ہے، مگر گاڑی کی حفاظت ان کی ذمے داری نہیں۔ ساحل پر مضر صحت اشیا بیچی جا رہی ہیں، مگر انہیں چیک کرنا کنٹونمنٹ کا کام نہیں۔ساحل پر گو کارٹ جانیں لے رہی ہے، مگر اسے روکنا کنٹونمنٹ کے ذمے نہیں۔لائف گارڈز کی تعیناتی کا بھی کوئی تصور نہیں، کیوں کہ یہ بھی کنٹونمنٹ کی ذمے نہیں آتا۔غیر معیاری جھولوں کا لائسنس دے کر پیسے بٹورنے کے بعد ٹیکنیکل ڈپارٹمنٹ سے ان جھولوں کو چیک کرانا بھی ان کی ذمے داری میں نہیں۔تفریح کی غرض سے بنائے جانے والے پارکس بھی ان کی حرام خوری سے محفوظ نہیں رہے۔صرف 3 سال تک کے بچوں کو رعایت دے کر عوام پر بہت بڑا احسان کیا گیا ہے، باقی پارک میں آنے والا کوئی بھی شخص بغیر فیس ادا کیے اندر داخل ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اس طرح کے تمام تر غیر قانونی کام میں ملوث کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن صرف عوام سے پیسے بٹورنے میں مصروف ہے، لیکن سہولیات کے نام پر انہیں صرف ''ٹھینگا'' دکھایا جاتا ہے۔

اگر کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن اور کلفٹن پولیس یہ سمجھتی ہے کہ 10 سالہ فرحان کی موت کی ذمے داری ان پر عائد نہیں ہوتی تو یہ ان کی سب سے بڑی بھول ہوگی۔کیوں کہ گو کارٹ کا معاہدہ کنٹونمنٹ بورڈ کلفٹن نے کیا تو دوسری طرف پولیس نے لائسنس اور فٹنس معیار کو چیک کیے بغیر انہیں ساحل پر آنے کی اجازت دی۔ان دونوں ڈپارٹمنٹس کے خلاف بھی سخت قانونی کارروائی ہونی چاہیے، تاکہ آئندہ ایسا کوئی حادثہ دوبارہ رونما نہ ہو۔اور اگر یہ ممکن نہیں تو پھر ٹریفک اہلکار بھی ساحل سمندر پر تعینات کر دیے جائیں، تاکہ آئندہ کوئی جانی نقصان نہ ہو۔

پانی بحران سے انتخابی منشور بھی پانی پانی

کراچی میں انتخابات کی گہما گہمی عروج پر پہنچ چکی ہے ۔تمام سیاسی جماعتوں کے قائدین کی نظریں اس وقت کراچی پر مرکوز ہیں جس کی کئی وجوہات ہیں ،لیکن سب سے اہم وجہ ایم کیوایم کی تقسیم در تقسیم اور کراچی کے ان گنت مسائل ہیں ۔ ایم کیوایم کے کمزور ہونے کے بعد اب ہر سیاسی جماعت کے قائد کو کراچی میں مسائل ہی مسائل نظر آنے لگ گئے ہیں، اور وہ بھی انہی کو اپنے منشور میں شامل کر کے کراچی کے باسیوں کو ایک مرتبہ پھر بے وقوف بنانے پر تلے ہوئے ہیں ۔

کراچی دنیا کا واحد ایسا شہر ہے جو بے شمار مسائل اپنی گود میں لیے دنیا کا ساتواں بڑا میگا سٹی بن گیا ہے ۔شہر قائد کے ہر مسئلے کے پیچھے انتظامی بدعنوانی ،کرپشن اور سیاسی مفاہمت پوشیدہ ہے جو ان مسائل کو حل نہیں ہونے دیتی ۔دنیا کے ساتویں بڑے شہر کو جن بڑے مسائل کا سامنا ہے ان میں پبلک ٹرانسپورٹ ،گندگی کے ڈھیر ،لینڈ مافیا ،پانی کی عدم فراہمی اور بجلی کی طویل اور غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ بھی شامل ہے جو کئی عرصے سے توجہ کے متقاضی اور فوری حل طلب ہیں ۔لیکن ستم ظریفی دیکھیے کہ جنھوں نے شہر قائد پر 30، 30 سال اور 10،10 سال حکومتیں کیں ،وہ آج انہی مسائل کو دوسروں کے سر تھوپ کر ایک مرتبہ پھر سے اسی پرانے مسائل کو جنہیں وہ آج تک حل نہیں کر سکے، بنیاد بنا کر عوام سے ووٹ طلب کر رہے ہیں ۔سیاسی جماعتوں کے قائدین کے بیانات سنیں تو لگتا ہے کہ جیسے ان مسائل کی وجہ وہ نہیں بلکہ عوام خود ہیں ،اور عوام نے ہی یہ مسائل اپنے لیے خود پیدا کیے ہیں ،جن میں ان پارٹی اور ان کے رہنماؤں کا کوئی قصور نہیں ۔

چند روز قبل مسلم لیگ ن کے صدر اور سابق وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف کراچی آئے اور اپنے حلقے بلدیہ ٹاؤن میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ بلدیہ ٹاؤن میں پانی کا مسئلہ تین سال میں حل کر دیں گے اور ساتھ ہی انفراسٹرکچر اور ٹرانسپورٹ کے مسئلے کے حل کی بھی یقین دہانیاں کرائیں ۔لیکن شاید میاں شہباز شریف بھول رہے ہیں کہ یہ کراچی ہے ،یہاں کے لوگ پان ضرور کھاتے ہیں مگر دھوکا نہیں ۔

بلدیہ ٹاؤن کے علاقہ معززین سے جب شہباز شریف کے دورے اور ان کے وعدوں سے متعلق بات چیت کی گئی تو علاقہ معززین نے کئی سوالات اٹھائے ،جس میں پہلا سوال یہ تھا کہ بلدیہ ٹاؤن میں پانی گزشتہ 5 سال سے نایاب ہے ،بلدیہ ٹاؤن کی 6 یوسی چیئر مین ن لیگ سے تعلق رکھتے ہیں جب پانی کا مسئلے کیلیے ان سے بات کی جاتی تھی وہاں سے ایک ہی جواب ملتا تھا کہ اول تو ہمارے پاس فنڈز نہیں اور نہ ہی ہمارے پاس اختیارات ہیں ،ساتھ ہی وہ یہ بھی

کہتے تھے کہ دعا کریں بارش ہوں تاکہ حب ڈیم میں پانی آئے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا شہباز شریف کس طرح ایک سیٹ لے کر اس علاقے کا مسئلہ حل کریں گے۔کیا وہ بھی الیکشن جیتنے کے بعد عوام سے یہ ہی کہیں گے کہ دعا کریں بارش ہو، تاکہ حب ڈیم میں پانی آئے۔

میاں برادران جب حکومت میں تھے تب انہیں کراچی کا خیال نہیں آیا۔تب انہوں نے پانی کیلئے کوئی حکمت عملی پیش نہیں کی۔عوام کا احتجاج تو پانچ سال سے جاری ہے تو اب کس طرح انہیں عوام کے پیاسے ہونے کا خیال آگیا؟اس وقت کیوں کوئی ٹھوس حکمت عملی نہیں بنائی گئی اور نہ ہی اس وقت ان کے یوسی چیئرمینوں کو کوئی لاج آئی جس طرح وہ آج کہہ رہے ہیں کہ ہم یہ مسئلہ حل کریں گے۔اس وقت عوام سے دعاؤں کیلئے کہا جاتا تھا تو کیا اب آسمان سے پانی برسائیں گے یا پھر وہی جملہ دہرایا جائے گا کہ دعائیں کریں بارش ہو۔عوام کے احتجاج میں کبھی ان کے پارٹی عہدیداران نے شرکت نہیں کی، کیا اس وقت ان کا مقصد صرف اور صرف پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم کو گندہ کرکے اپنی سیاست چمکانا تھا؟

پانی کا مسئلہ اب چونکہ صرف بلدیہ ٹاؤن یا اورنگی تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے پورے کراچی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔بلدیہ ٹاؤن کو پانی کی فراہمی کے دو ہی ذرائع ہیں جن میں سے ایک حب ڈیم اور دوسرا کے تھری پروجیکٹ ہے۔حب ڈیم کی صورت حال یہ ہے کہ وہاں پانی کی سطح انتہائی کم ہو کر محض دو فٹ رہ گئی ہے۔جب کہ کے تھری کو منچھر جھیل سے پانی کی فراہمی ہوتی ہے،اب دونوں جگہ پانی دستیاب نہیں؛ایسے میں کس طرح شہباز شریف بلدیہ ٹاؤن کو پانی فراہم کریں گے؟کیا پنجاب کی طرح یہاں بھی 56 صاف پانی کی کمپنیاں بنائیں جائیں گی؟یا پھر لاہور سے پانی کی کوئی لائن بلدیہ ٹاؤن تک بچھائی جائے گی؟یہ سب عوام کو بے وقوف بنانے کے دعوے اور وعدے ہیں جو ہر الیکشن میں کیے جاتے ہیں اور الیکشن ہونے کے بعد ان وعدوں اور دعوؤں کی ہنڈیا بیچ چوراہے پر ہی پھوٹتی ہے۔

پانی کے مسئلے کا واحد حل ڈیمز بنانے میں ہے،مگر کوئی بھی سیاسی پارٹی اس پر بات کرنے کو تیار نہیں،وہ اس لیے کہ اگر مسائل حل ہونا شروع ہو گئے تو عوام کو اپنے ووٹ کی اہمیت معلوم ہو جائے گی اور اس کے بعد کوئی بھی ان کے بہکاوے میں نہیں آئے گا۔لہٰذا ''جس طرح چل رہا ہے چلنے دو'' والی پالیسی اپنائی ہوئی ہے۔ملک کو اس وقت پانی کی شدید قلت کا سامنا ہے،جس پر کسی سیاسی پارٹی نے کبھی بھی کوئی توجہ نہیں دی۔اب جب کہ چیف جسٹس آف پاکستان نے اس پر ایکشن لیا ہوا ہے تو اس پر بھی ان سیاسی قائدین کو اپنی سیاست کی فکر پڑ گئی ہے،ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو چکی ہیں۔اگر ان سیاسی جماعتوں کو کالا باغ ڈیم سے الرجی ہے تو اس کا نام بدل کر پاکستان ڈیم رکھ لیں، کیوں کہ اسے پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ہی پاکستان کی بقا ہے۔ورنہ چند سالوں بعد پاکستان صرف ایک بنجر زمین ہوگا اور یہاں ایک ایک بوند کیلئے لوگ ایک دوسرے کی جان کے درپہ ہوں گے۔

دیوانے کا خواب

''چیف جسٹس صاحب نے ان اسکولوں کے بارے میں ہدایات جاری کی ہیں جن کی فیس 5000 سے زائد ہے۔
جب کہ ہماری فیس تو محض 4999 روپے ہے۔ سپریم کورٹ کا کوئی ایسا حکم نامہ ہے جس میں لکھا ہو کہ پانچ ہزار سے کم فیس لینے والے اسکولز بھی فیس کم کریں؟ اگر ہے تو سامنے لاؤ۔ ورنہ فیس بھرو۔'' یہ حکمنامہ جاری ہونے کے بعد کئی اسکولوں نے من مانی کرتے ہوئے اپنی فیسیں بڑھادی ہیں۔ کیوں کہ تلوار پانچ ہزار سے زائد فیس لینے والے اسکولوں پر لٹکی ہے، نہ کہ ڈھائی ہزار روپے سے زائد لینے والے اسکولوں پر۔
چیف جسٹس صاحب کا یہ حکم ان والدین کے لیے تو ضرور خوشی کا باعث ہے جن کے بچے بڑے اور عالیشان اسکولز میں پڑھ رہے ہیں، جن کے لیے پانچ ہزار کی رقم کچھ بھی نہیں۔ مسئلہ تو ان غریب والدین کے لیے ہے جن کے لیے پانچ سو روپے بھی ایک بہت بڑی رقم تصور کی جاتی ہے۔ وہ کس طرح اپنے بچوں کو پڑھا رہے ہیں اس کا حال وہ جانیں یا خدا جانے۔ چیف جسٹس صاحب کو اس کا علم نہیں، اور نہ ہی حکمرانوں کو اس بات سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ والدین کس طرح فیسیں ادا کرتے ہیں۔ حکومت ٹیکس لے کر ایک طرف ہو جاتی ہے اور بھگتنا غریب عوام کو پڑتا ہے۔
جن صاحب کے دو بچے ہیں اور دونوں ہی اسکول جانے کی عمر کو پہنچ چکے ہیں، ان کے لیے سب سے بڑا مسئلہ معیاری تعلیم کی عدم فراہمی اور بڑھتی فیسیں ہیں۔ ایک دوست سے کل ملاقات ہوئی، اس نے پانچ ہزار روپے ادھار مانگے۔ ساتھ ہی وجہ بھی بتائی کہ 10 تاریخ تک بچوں کی اسکول کی فیس جمع کرانی ہے۔ میں نے پوچھا پانچ ہزار روپے فیس؟ جس پر اس کا جواب تھا ہاں۔ ایک ماہ کی فیس 2700 روپے ہے اور جنوری کے ساتھ جون کی فیس بھی طلب کی گئی ہے۔ جو ٹوٹل 5400 روپے بنتے ہیں۔
ایک بچہ محلے میں ہی ایک گھر میں قائم اسکول میں پڑھتا ہے، اس کی فیس کم ہے، اس لیے وہ تو بھر دی ہے۔ مگر دوسرا بچہ مہنگے اسکول میں پڑھتا ہے، اس لیے اس کی فیس زیادہ ہے۔
بچوں کو الگ الگ اسکول میں بھیجنے کی وجہ پوچھنے پر اس نے بتایا کہ دوسری کلاس تک علاقے میں تعلیم دلوا سکتا ہوں، کیوں کہ اس سے آگے کی تعلیم وہاں پر اس قابل نہیں کہ بچوں کو بھیجا جا سکے؛ کیوں کہ میٹرک اور مڈل پاس ٹیچر ہیں۔

اس لیے دوسرا بچہ اب تیسری کلاس میں ہے اور وہ ایک مہنگے اسکول جاتا ہے ۔مہنگے اسکول میں کیا معیاری تعلیم ہے؟ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ پہلے وہ مہنگا نہیں تھا، لیکن اب انہوں نے اپنی فیسیں بڑھادی ہیں، میں نے دوسرا اسکول تلاش کیا جہاں بچوں کا داخلہ کراسکوں، مگر وہاں پر اس سے بھی زیادہ فیسیں ہیں ۔اس لیے مجبوری ہے بچوں کو یہیں پڑھا رہا ہوں ۔تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟ میرے پوچھنے پر جواب ملا، بیس ہزار روپے ۔ساتھ یہ بھی بتادیا کہ جس مکان میں رہتا ہوں وہاں کا کرایہ بھی 10 ہزار روپے ہے ۔ایک شخص جس کی تنخواہ 20 ہزار روپے ہو، وہ کس طرح اپنے دو بچوں کو پڑھا سکتا ہے، کس طرح ان کی دیکھ بھال کرسکتا ہے، کیا وہ انہیں اچھا کھانا پینا کھلا سکتا ہے؟ ان سب سوالوں کا ایک ہی جواب نا ں میں ملتا ہے ۔

اس ملک کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں ہر چیز کا قانون موجود ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ عملدرآمد کسی پر نہیں ۔اسکول والے اپنی مرضی سے فیسیں بڑھاتے ہیں، مالک مکان اپنی مرضی سے کرایہ بڑھادیتا ہے، بجلی اور گیس والے اپنی مرضی کا بل بھیج دیتے ہیں، سبزی فروش اپنی مرضی کے مطابق سبزی بیچتا ہے، دودھ والے مرضی کی قیمتیں وصول کرتے ہیں، پرچون کی دکان پر ہر چیز اپنی مرضی کے نرخ پر بک رہی ہے ۔

بات یہیں ختم نہیں ہوتی ہر سرکاری اداروں میں چلے جائیں تو وہاں بھی یہی صورت حال ہے ۔کورٹ میں سو روپے والا اسٹامپ پیپر 250 روپے کا بک رہا ہے مگر کوئی پوچھنے والا نہیں ۔وکلاء کے بھی الگ الگ ریٹ ہیں ۔جونیئر اپنی مرضی کے پیسے بٹورتا ہے اور جب کیس خراب ہوجاتا ہے تو پھر سینئر اپنی مرضی کے پیسے وصول کرکے اس غریب کو کنگال کردیتا ہے ۔شہر میں کسی بھی جگہ چلے جائیں، پارکنگ کے نام پر الگ الگ پیسے وصول کیے جاتے ہیں ۔پارک جائیں تو مرضی کی انٹری فیس وصول کی جارہی ہے ۔اسپتال جائیں تو وہاں پر مریض اور اس کے لواحقین کا الگ خون چوسا جاتا ہے ۔میڈیکل پر ادویات اپنی مرضی کے نرخ پر بک رہی ہیں ۔

پبلک ٹرانسپورٹ کے کرائے بھی اپنی مرضی کے ہیں ۔کوئی بیس روپے تو کوئی بدمعاشی سے تیس روپے وصول کررہا ہے ۔رکشہ، ٹیکسی بک کراؤ تو ان کے پیسے بھی اپنی مرضی کے ہوں گے ۔ایک رکشہ 100 روپے لے رہا ہے تو دوسرا 150 روپے بٹور رہا ہے ۔یونین کونسل آفس میں برتھ سرٹیفکیٹ کے ریٹ بھی مرضی کے ہیں، جس کی فیس دو سو روپے ہے اس کی فیس تین سو روپے وصول کی جارہی ہے ۔سڑکوں پر کھڑے پولیس اور ٹریفک پولیس اہلکار بھی اپنے اپنے جیب خرچ اپنی اپنی مرضی کے مطابق وصول کررہے ہیں ۔کوئی ڈرا کر پیسے وصول کررہا ہے تو کوئی اندھے قانون کا سہارا لے کر لوٹ رہا ہے ۔ایک ہیلمٹ کا بہانہ بنا کر سو روپے لے لیتا ہے تو روڈ کے کونے میں کھڑا پولیس اہلکار تلاشی کے بہانے دو سو روپے نکال لیتا ہے ۔مطلب کوئی محکمہ ایسا نہیں جہاں پر لوٹ مار نہ مچی ہو ۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ محترم چیف جسٹس صاحب اور وزیراعظم صاحب اور تمام بااختیار افسران اپنے اپنے مفادات کی طرف دیکھ رہے ہیں ۔چیف جسٹس صاحب ڈیم بنانے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ۔مانا کہ ڈیم ہماری بقا ہے

اور یہ ایک احسن قدم ہے جو انہوں نے اٹھانے کی کوشش کی ہے، لیکن عوام کی طرف کون دیکھے گا، ان کے مسائل کون حل کرے گا؟

وزیراعظم صاحب کرپشن کے خاتمے کا خواب بیچ رہے ہیں اور باقی وزرا اور افسران اپنی اپنی کرسی بچانے کے لیے تگ و دو کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو خالصتاً عوام کے لیے سوچتا ہو، جو ان کا دکھ سکھ سمجھتا ہو، ان کی تکلیف پر لبیک کہتا ہو۔ ایسا اس ملک میں شاید کوئی نہیں۔ اور یہ بھی کیسے ممکن ہے کہ ان مسائل کے بارے میں ان ارباب اختیار کو علم ہی نہ ہو۔ اور اگر ایسا ہے تو پھر انہیں اپنی کرسی پر بھی بیٹھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ مگر پھر بھی وہ لوگ ہم پر حکمران بنے بیٹھے ہیں۔

ایک غریب شخص کبھی بھی ان لوگوں تک نہیں پہنچ سکتا جس کا عملی مظاہرہ وہ روز صبح و شام سڑکوں اور میڈیا پر دیکھتے ہیں۔ جہاں پروٹوکول کے نام پر سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں، جہاں پر وٹوکول کے نام پر پولیس شہریوں سے بدمعاشی پر اتر آتی ہے۔ ایسے میں کوئی کس طرح ان تک پہنچ سکتا ہے۔ اول تو اس غریب کو دفتر کے باہر موجود چوکیدار ہی اندر نہیں جانے دیتا، اور اگر کسی طرح وہ اندر پہنچ بھی جائے تو پہلے سیکرٹری، پھر اپوائمنٹ اور پھر پیون سے نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔ آخر میں ملاقات کا شوقین ملاقات کر کے مایوس ہی لوٹتا ہے۔ کیوں کہ سامنے سے ایک ہی جواب ملتا ہے کہ اچھا دیکھتے ہیں۔ اور یہ وہ جملہ ہے جو پاکستان میں ہر وقت ہر جگہ ہر افسر کے منہ پر تیار رہتا ہے۔

آہ! ننھی سکینہ

ایم اے جناح روڈ پر بسوں کی ریس نے گھر سے اسکول جانے والی ایک ننھی پری کی جان لے لی۔خبر آئی، ہم نے سنی اور پھر شام تک وہ ماضی کا قصہ بن گئی۔لیکن والدین کی اکلوتی بیٹی 4 سالہ ننھی سکینہ نے جاتے جاتے آج پھر کئی سوالات اٹھا دیئے اور ساتھ ہی حکومت کے منہ پر طمانچہ بھی دے مارا۔یہ الگ بات ہے کہ خواب خرگوش کے مزے لینے والی حکومتیں اسے محسوس کرنے سے قاصر رہتی ہیں۔

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا اور دنیا کا ساتواں بڑا شہر ہونے کے باوجود ابھی تک ٹریفک کے موثر نظام سے محروم ہے۔اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ پولیس اہلکاروں کو سڑکوں پر کھڑا کر دینے اور چند لائسنس برانچز بنا دینے سے نظام مکمل ہو جاتا ہے تو اسے احمقوں کی جنت میں رہنے والا ہی کہا جا سکتا ہے۔

جب بھی کوئی حادثہ رونما ہوتا ہے تو سیاسی مداری ٹاک شوز میں آ کر یورپی ممالک کے نظام کی بات کرتے ہیں، مگر اپنے ملک میں اس نظام کو رائج کرنے میں آج تک کسی نے بھی کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔سندھ کا وزیر ٹرانسپورٹ کون ہے؟ شاید ہی عوام کو اس بارے میں معلوم ہوگا۔عوام تو دور کی بات، ممکن ہے وزیر اعلیٰ سندھ کو بھی وزیر ٹرانسپورٹ کو ڈھونڈنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہو۔

کراچی میں آج بھی تیس سے چالیس سال پرانی بسیں سڑکوں پر بدمست ہاتھیوں کی طرح دندناتی پھر رہی ہیں۔ان بسوں اور کوچز کی میعاد عرصہ دراز پہلے ہی ختم ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود انہیں چند روپوں کے عوض بغیر کچھ سوچے سمجھے سڑکوں پر لانے کا اجازت نامہ تھما دیا جاتا ہے۔سونے پر سہاگہ یہ ہے کہ لائسنس برانچز میں بھی یہی سب کچھ چل رہا ہے، سفارشی اور بھاری رشوت دینے والا کسی ٹیسٹ کا محتاج نہیں اور غریب وہاں بھی کئی بار ٹرائل دینے کے بعد بھی لائسنس سے محروم رہتا ہے۔شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر سب کو لائسنس جاری کر دیئے تو پھر ان کی اندھی کمائی کا ذریعہ بند نہ ہو جائے۔

دنیا کے کسی بھی ملک میں پبلک ٹرانسپورٹ میں ٹوکن سسٹم رائج نہیں مگر کراچی سمیت ملک کے دیگر بڑے شہروں میں یہ نظام پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہے، جس کے باعث خونی حادثات وواقعات اب معمول کا حصہ بن چکے ہیں۔ سڑکوں پر موجود کالی بھیڑیں ان ریس لگاتی گاڑیوں کا چالان کرنے سے کتراتی ہیں۔وجہ صرف وہی چند روپے ہیں جن کی بدولت ان کا یہ کرپٹ نظام چل رہا ہے۔

ایسے کتنے ہی حادثے اور سانحے آئے روز اخبارات اور ٹی وی کی ہیڈ لائنز میں شامل ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔ کہیں والدین کا اکلوتا سہارا اس کرپٹ نظام کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے تو کہیں اپنی آنکھوں میں ڈاکٹر بننے کے خواب سجانے والی طالبہ ریس لگاتی بسوں کی زد میں آکر اس جہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔ چند سال قبل بلدیہ ٹاؤن میں پیش آنے والا واقعہ ننھی سکینہ کی طرح کا ہی ہے، جب ایک نوجوان نکاح سے صرف دو گھنٹے قبل ضروری کام کے تحت گھر سے اپنے ایک عزیز کے ساتھ باہر نکلا اور چند منٹوں بعد ہی وہ سڑک پر تڑپ تڑپ کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا اور اس نا اہل اور کرپٹ نظام پر سوالیہ نشان چھوڑ گیا۔ ان تمام حادثوں کی وجہ ایک ہی رہی مگر گھرانے سیکڑوں برباد ہوئے۔

ہم روزانہ سڑکوں پر مشاہدہ کرتے ہیں کہ بغیر ہیلمٹ موٹر سائیکل سوار کو دیکھ کر کس طرح پولیس کی آنکھ میں چمک آجاتی۔ دور سے ہی اسے رکنے کا اشارہ کر کے سائیڈ پر لے جایا جاتا ہے اور عموماً صرف پچاس روپے میں اپنا ایمان بیچ کر دل کو تسلی دیتے ہیں کہ یہ کوئی گناہ نہیں۔

جی ہاں! یہ ایک ٹریفک پولیس اہلکار کا جواب ہے کہ سو پچاس روپے لینا رشوت کے زمرے میں نہیں آتا، نہ ہی اس پر کوئی گناہ ہے؛ جس کی وجہ اس نے کچھ اس طرح بیان کی کہ ہمیں سرکار پیٹرول کے پیسے نہیں دیتی تو ہم اس طرح پیٹرول کے پیسے پورے کرتے ہیں۔

آئی جی سندھ اس حوالے سے کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ پولیس کا نظام دو صدی پرانا ہے، اس میں تبدیلی انتہائی ضروری ہے۔ مگر اس میں تبدیلی کرنے والے اپنے اپنے مفادات کو مدِ نظر رکھے ہوئے ہیں۔ پولیس میں سیاسی بھرتیاں، جعلی ڈگریاں، نا اہل اور کرپٹ لوگوں کی بھرمار ہے۔ سپریم کورٹ میں پیش کی گئی رپورٹ میں جو اعدادوشمار بیان کیے گئے ہیں وہ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ گھناؤنے کام پولیس سرپرستی میں آج بھی جاری و ساری ہیں جنہیں کوئی روکنے والا نہیں کیونکہ قانون اتنا طاقتور نہیں کہ وہ ان کے خلاف سخت کارروائی کر سکے۔

کراچی میگا ٹرانسپورٹ پروجیکٹ کے حوالے سے ہم گزشتہ کئی سال سے سنتے آرہے ہیں۔ مگر یہ ایسی کونسی راکٹ سائنس ہے جو مکمل ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ درحقیقت حکومت سندھ ٹرانسپورٹ مافیا کے سامنے ہمیشہ کی طرح آج بھی بالکل بے بس ہے۔ وزیرِ ٹرانسپورٹ نے اب تک جتنے بھی اجلاس ان کے ساتھ کیے، وہ صرف ان لوگوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کیے ہیں کیوں کہ وہ انہیں جلسوں اور جلوسوں کیلئے اپنی گاڑیاں فراہم کرتے ہیں اور بدلے میں من مانے کرائے بڑھا کر اپنا پیسہ سود سمیت واپس لے لیتے ہیں۔ کسی حادثے میں کوئی گاڑی جل جائے، اس کا پیسہ انہیں الگ سے دیا جاتا ہے۔

یونیورسٹی روڈ پر ہونے والا حادثہ کوئی پرانا تو نہیں مگر اس کا معاملہ کسی انجام کی طرف بڑھتا نظر نہیں آ؟ رہا۔ ان تمام حقائق سے عوام باخبر ہیں مگر ہماری حکومت اور اس کرپٹ نظام کو چلانے والے آج بھی انجان بنے ہوئے ہیں۔ اس ٹریفک

نظام پر عوام نے 1970 کی دہائی میں ہی فاتحہ پڑھ لی تھی جب پیپلز پارٹی کی حکومت نے ٹرام بند کر کے ٹرانسپورٹ کا بنا بنایا نظام پرائیویٹائز کر دیا تھا؛ اور آج یہی لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہم اس شہر کیلیے جدید ٹرانسپورٹ نظام بنا رہے ہیں۔ یہ عوام سے انتہائی بھونڈا مذاق ہے۔

کراچی سرکلر ریلوے کے نام پر بھی عوام کو اب تک بے وقوف ہی بنایا جا رہا ہے۔ سرکلر ریلوے کیلیے زمینوں پر انہی سیاسی مداریوں نے اپنے حمایتیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلیے قبضے کروا رکھے ہیں جو اب کچی آبادیوں میں تبدیل ہو چکے ہیں، جنہیں لیز بھی فراہم کر دی گئی ہے۔ اب اگر ان سے زمین واپس لی جائے تو بدلے میں اربوں روپے عوام کے پیسوں سے ان کو ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ یہ سب کچھ ایک منصوبہ بندی کے تحت کرایا گیا، کیوں کہ یہاں بات کسی منصوبے کی نہیں بلکہ اربوں روپے اور ووٹ بینک کی ہے۔

محافظ بنے راہ زن

گزشتہ روز میڈیا پر ایک ویڈیو دیکھ کر دل خون کے آنسو رونے لگا۔ویڈیو میں تین ننھے پھول اسپتال میں روتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ ہمارے امی ابو کو پولیس والوں نے مار دیا۔مکمل ویڈیو دیکھنا کسی بھی انسان کے بس میں نہیں تاہم جتنی ویڈیو دیکھ سکا اس کے بعد سے اب تک دل کو سکون میسر نہیں۔ہر وقت ان ننھے پھولوں کے رونے اور تکلیف کی شدت سے کراہنے کی آوازیں کانوں میں گونجتی ہیں۔

وطن عزیز میں پولیس گردی کوئی نئی بات نہیں۔کراچی ہو یا لاہور،فیصل آباد ہو یا حیدرآباد،ہر جگہ پولیس گردی کے شکار لوگ نظر آتے ہیں۔قانون کے نام پر وردی پہن کر لوگوں کی حفاظت کا حلف اٹھانے کے بعد جب عملی میدان میں قدم رکھتے ہیں تو ان کا بھیانک چہرہ دیکھ کر ہی انسان خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ساہیوال،قادرآباد کے قریب پنجاب پولیس کے محکمہ انسداد دہشت گردی (سی ٹی ڈی) کی فائرنگ سے ماں بیٹی سمیت 4 افراد جاں بحق اور 3 بچے زخمی ہو گئے۔یہ محض اداروں کیلیے ایک خبر اور سننے والوں کیلیے صرف ایک لمحے کیلیے صدمے کا باعث ہوگا،لیکن جس گھر پر یہ قیامت ٹوٹی ہے اس کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے؛اور جو قیامت ان بچوں پر آئے روز اب گزرے گی،یہ وہی جانتے ہیں۔

پنجاب پولیس کی تاریخ میں اس قسم کے واقعات بھرے پڑے ہیں جن میں سانحہ ماڈل ٹاؤن آج بھی تازہ لگتا ہے۔اس میں بھی پولیس نے اپنی کالی وردی کی طاقت کا غلط استعمال کرتے ہوئے 17 نہتے لوگوں کو شہید کر دیا تھا اور آج بھی پنجاب پولیس نے 4 نہتے لوگوں کو اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا۔جس طرح ہر سانحے کے بعد انکوائری کمیٹیاں بنتی ہیں، جے آئی ٹیز بنتی ہیں،اس پر بھی پہلی فرصت میں روایتی جے آئی ٹی اور انکوائری کمیٹیاں بنادی گئی ہیں۔ہمارے منتخب کردہ عوامی نمائندوں کی طرف سے بھی روایتی بیان داغ دیا گیا ہے کہ جو گناہ گار ہوگا اسے سزا ملے گی۔لیکن اس قسم کے واقعات کو روکنے کیلیے کبھی کسی نے ٹھوس اقدامات کرنے ضرورت محسوس نہیں کی۔قانون کی بالادستی کی بات ضرور ہوتی ہے مگر عمل درآمد کبھی کسی نے نہیں کروایا اور نہ ہی کمزور قانون کے باعث اب تک کسی بھی مجرم کو کیفر کردار تک پہنچایا جاسکا ہے۔

زینب قتل کیس بھی سوشل میڈیا کے ذریعے ہی عوام الناس تک پہنچا اور عوام الناس نے ہی اس پر آواز اٹھائی جس کے بعد انتظامیہ حرکت میں آئی اور چند دنوں بعد مجرم عمران قانون کی گرفت میں آ سکا۔عمران کی گرفتاری میں پولیس سے زیادہ عوام کا کردار رہا جنہوں نے دن رات ایک کر کے عمران کا سراغ لگانے میں خفیہ اداروں کے ساتھ تعاون کیا۔

لیکن ایسے کئی کیس اب بھی ریکارڈ پر موجود ہیں جن کے ملزمان آج بھی قانون کا مذاق اڑاتے ہوئے قانون کی چھتری تلے کھلی فضا میں سانس لے رہے ہیں اور دوسرے معصوموں کی زندگی کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کی پلاننگ میں مصروف ہیں۔

میڈیا پر آنے والی اس ویڈیو میں یہ ننھے پھول جو ابھی نہ تو کچھ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے بچاؤ کیلیے کچھ سوچ سکتے ہیں اور نہ ہی ان میں بدلہ لینے کی طاقت ہے، وہ بلک بلک کر ہم سے سوال کر رہے ہیں کہ ہمارا کیا قصور؟ ہمیں کیوں اس قیامت کیلیے چنا گیا؟ کیوں ہمارے ماں باپ کو ہماری آنکھوں کے سامنے قتل کر دیا گیا؟ کیا دنیا میں ہم اپنی مرضی سے آئے جس کا خمیازہ اب ہمیں بھگتنا ہوگا یا پھر ہمیں اس لیے ہی دنیا میں لایا گیا کہ ہم پر اس طرح کا ظلم کیا جائے؟ ابھی تو ہم نے ٹھیک سے بولنا بھی نہیں سیکھا، ابھی تو ہم نے چلنا بھی نہیں سیکھا، ابھی تو ہم نے ممتا کا چہرہ بھی ٹھیک سے نہیں دیکھا، ابھی تو ہم نے چڑیا کو چہچہاتے سنا ہے، ابھی تو ہم نے پھول کھلتے ہوئے ہی دیکھے ہیں، ابھی تو ہم نے خدا کی خلق کو ٹھیک سے جانا بھی نہیں، ابھی تو ہم نے مذہب کو بھی نہیں سمجھا۔ ہمیں تو یہ بھی علم نہیں کہ مارنے والا کون ہے، نہ ہم یہ جانتے ہیں ہمیں اس درد بھری زندگی سے آشنا کیوں کرایا جا رہا ہے۔ نہ ہم اس کی فریاد کسی سے کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے بچاؤ کیلیے کچھ کر سکتے ہیں۔ ابھی ہم اس قابل نہیں کہ بدلہ بھی لے سکیں۔

بے شک ہم پر ہونے والا یہ ظلم اس ریاست پر قرض ہے۔ اس ریاست کے امیر قاضی پر اور اس ریاست کے سپہ سالار پر قرض ہے۔

یہ حاکم وقت کی ذمے داری ہے کہ وہ اس پر فوری ایکشن لے کیوں کہ ان ننھے پھولوں کے ساتھ ہونے والا ظلم قیامت صغریٰ سے کم نہیں۔ یہ صرف ریاست نہیں بلکہ ریاست کے سپہ سالار اور امیر قاضی پر واقعی ایک بہت بڑا قرض ہے۔

اس قرض کو اتارنا اب ریاست اور ریاستی اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ ان ننھے پھولوں کو انصاف فراہم کریں اور ان کے والدین کو ناحق قتل کرنے والے جانوروں کو کیفر کردار تک پہنچائیں۔ ریاست اگر اس میں کوتاہی برتتی ہے تو یہ ان معصوم فرشتوں پر مزید ظلم ہوگا جس کا جواب امیر ریاست کو اللہ کے سامنے ضرور دینا ہوگا۔

یہ ننھے فرشتے اگر کسی مقبول و معروف شخصیت کے ہوتے تو شاید اب تک پولیس وردی میں ملبوس کالی بھیڑیں قانون کی پکڑ میں آچکی ہوتیں لیکن شاید یہ کسی غریب کے آنگن کے پھول ہیں اس لیے وزیراعلیٰ پنجاب نے اس پر بات تک کرنے سے گریز کیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں انصاف کے حصول کیلیے ہمیں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہوتا ہے کیوں کہ ایک غریب کی پہنچ نہ تو حاکم وقت تک ہے اور نہ ہی ریاست کے امیر قاضی تک۔

ایسے میں انصاف کے متلاشی کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے؛ اور وہ یہ کہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرے۔

ہمارے محافظ بھی بلاشبہ اب ہمارے نہیں رہے۔ ان کی ذمے داری میں عوام الناس نہیں بلکہ وہ لوگ شامل ہیں جن کے ہاتھ میں طاقت یا جن کی جیب میں مال ہو، ہمارے محافظوں کا جھکاؤ ان کی طرف زیادہ رہتا ہے۔ کبھی پولیس کے نام

سے لوگوں کے دلوں میں اطمینان آتا تھا مگر آج ایک عام آدمی پولیس کا نام سن کر ہی خوف زدہ ہو جاتا ہے۔ تھانہ کلچر کا جس طرح فروغ کیا گیا، اس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ہمارے محافظ سڑک پر کھڑے ہوں تو ہمیں اپنے لٹنے کا ڈر لگا رہتا ہے۔ پروٹوکول میں چل رہے ہوں تو سڑک پر کچلے جانے کا ڈر لگا رہتا ہے، تھانے میں ہوں تو خود ہی کو مجرم سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ کمزوریاں صرف قانون میں نہیں بلکہ ناقص سسٹم کی بھی واضح مثال ہیں، جسے اب بدلنا ہوگا ورنہ آج جس طرح قانون کے نام پر لوگوں کا قتل عام کیا جا رہا ہے، کل یہ ہاتھ امیروں کے گریبان پر بھی ہوں گے۔

ٹیکنالوجی کے بغیر مسائل کیسے حل ہوں؟

میں اپنے کئی بلاگز میں کراچی کے مسائل پر گفتگو کرچکا ہوں اور وقتاً فوقتاً ان کا حل بھی پیش کرتا رہا ہوں ۔تاہم کراچی کے کچرے پر آج کل سیاسی گرما گرمی عروج پر ہے ۔آرٹیکل 149 کے تحت کراچی کو وفاق کے تحت کرنے کی منصوبہ بندی کی جارہی ہے ۔کراچی قیام پاکستان سے قبل اور بعد تک دارالحکومت رہا ہے ۔اسی طرح یہ شرف حیدرآباد کو بھی حاصل ہے ۔جب تک یہ دونوں شہر دارالحکومت رہے تب تک اس شہر کے مسائل نہ ہونے کے برابر تھے ۔ایک منظم سسٹم کے تحت تمام امور نمٹائے جارہے تھے ۔

کراچی کے مسائل سیاسی مفادات کے تحت سیاستدانوں کے خود پیدا کردہ ہیں جس میں پانی کا مصنوعی بحران، بجلی کی غیر اعلانیہ لوڈشیڈنگ، صفائی ستھرائی کے ناقص انتظامات، پبلک ٹرانسپورٹ کا بے ڈھنگا پرائیوٹ نظام اور اب کراچی کا کچرا شامل ہیں ۔ہم بھارت کا مذاق اڑانے میں لگے رہے کہ وہ چاند پر پہنچ نہیں سکا،صرف دو منٹ کی دوری پر ہی اس کا نظام فیل ہوگیا ۔لیکن دیکھا جائے تو درحقیقت ہمارے سیاستدانوں کا دماغ فیل ہوچکا ہے، بھارت نے اپنی محنت اور کوشش سے چاند کے اس حصے کو چھونے کی کوشش کی جہاں اب سے پہلے کوئی نہیں گیا ۔مگر ہم تو وہاں بھی نہ پہنچ سکے جہاں دنیا کئی برس پہلے ڈیرے جما چکی ہے ۔اب تو چاند سے آگے بھی دنیا کی تلاش شروع کردی گئی ہے ۔ہم آج بھی لکیر کے فقیر کی طرح دوسروں کا مذاق اڑانے میں ہی اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں ۔معاف کیجیے ہم آج بھی کچرے پر سیاست کررہے ہیں اور شاید یہی ہمارا مقدر بن چکا ہے ۔کچرے کا مسئلہ حل ہوگا تو اس کے بعد سیوریج کی باری آئے گی، اسی طرح ہم روزانہ ایک مسئلہ پیدا کریں گے اور ایک مسئلہ حل کریں گے ۔پاکستانیوں کی زندگی اسی میں گزرجائے گی ۔

ہم نے تعلیم پر کوئی توجہ دینی ہے اور نہ ہی ہم نے آئی ٹی شعبے کی طرف دیکھنا ہے جو انتہائی پستی کا شکار ہے ۔بھارت ہمارے ساتھ آزاد ہوا اور بنگلا دیش ہم سے کئی برس بعد وجود میں آیا ۔لیکن تعلیم اور آئی ٹی کے شعبے میں یہ دونوں ملک بلین ڈالرز باہر سے اپنے ملک بھیج رہے ہیں جب کہ ہم تعلیم بھی باہر جا کر حاصل کررہے ہیں اور آئی ٹی بھی وہ استعمال کررہے ہیں جو یہ دونوں ممالک استعمال کرکے پھینک دیتے ہیں ۔کراچی پاکستان کو کما کر دینے والا ایک ایسا بڑا بیٹا ہے جس کے حصے میں صرف قربانیاں ہی لکھی گئی ہیں ۔کراچی کے نصیب میں خوشحالی نہیں، اب کراچی صرف اپنے زخموں کو دیکھ دیکھ کر تکلیف سے کراہ رہا ہے اور اس کی موجودہ حالت کے ذمے دار ہمارے وہ نیم حکیم سیاسی ڈاکٹرز ہیں

جنہیں اگر کان کا درد بتایا جائے تو وہ دانت نکال دیتے ہیں۔ کراچی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کیا گیا۔ تکلیف ان سیاسی ڈاکٹروں سے تھی اور زخم دل میں کر دیے۔

اب بھی حالات کو قابو کیا جا سکتا ہے اور آرٹیکل 149 کے نفاذ کے بغیر ہی مسائل حل ہو سکتے ہیں اگر سیاسی نیم حکیم ڈاکٹر سنجیدگی اختیار کریں۔ آج دنیا میں ہر جگہ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے اور وہ لوگ اس کا ہر شعبے میں بھرپور استعمال بھی کر رہے ہیں جس سے ایک طرف ان کی معیشت دن رات ترقی کر رہی ہے وہیں ان کے عوامی مسائل میں بھی 80 فیصد کمی آئی ہے۔ چین نے ایک حال ہی میں ایک منصوبہ پیش کیا ہے جس میں اس نے آئی ڈی کارڈ، ڈیبیٹ کارڈ اور نقد رقم سے لوگوں کو چھٹکارا دلایا ہے۔ اس کا متبادلہ صرف اس کا چہرہ ہوگا جس سے اس کی تمام تر بنیادی ضروریات پوری ہو جائیں گی۔

کراچی کے مسائل کا واحد حل یہ ہے کہ ملازمین تبدیل کیے جائیں، مثال کے طور پر بلدیہ ٹاؤن کے تمام ملازمین کو لانڈھی ٹاؤن بھیج دیا جائے اور لانڈھی والوں کو بلدیہ، اسی طرح دیگر ٹاؤنز کے تمام افسران و ملازمین کو بھی آگے پیچھے کر دیا جائے۔ چیک اینڈ بیلنس کا سسٹم یہ رکھا جائے جس طرح یونائیٹڈ نیشن کے ذیلی ہیلتھ ادارے ڈبلیو ایچ او اپنے ملازمین کی آفس ٹائمنگ میں ہر وقت لوکیشن چیک کرتا ہے، اسی طرح ورکنگ گروپ بنا کر ہر ملازمین اور ہر افسران کی لوکیشن، وقت اور کام کی نوعیت چیک کی جائے۔ اسی طرح جی پی آر ایس سسٹم بھی مہنگا نہیں، حکومت جہاں عیاشی کے لیے کروڑوں روپے خرچ کر دیتی ہے وہیں چند ہزار روپے اس سسٹم پر لگا کر، تمام ملازمین کو جی پی آر ایس سسٹم سے لیس کر دینے سے جہاں ان ملازمین کی نقل و حرکت چیک کی جا سکتی ہے وہیں موقع پر انہیں پکڑا بھی جا سکتا ہے۔ اس سسٹم سے کئی فوائد حاصل ہوں گے اس سے نہ صرف وقت کی پابندی بھی ہوگی بلکہ حاضری سسٹم بھی۔ اسی طرح جی پی آر ایس سسٹم کے تحت کر دینے سے کوئی بھی لیٹ نہیں ہوگا اور جو لیٹ ہوگا اس کی آئی ڈی آٹومیٹک بلاک ہو جائے گی جس سے وہ شخص غیر حاضر تصور ہوگا اور اس کی تنخواہ میں کٹوتی بھی کر دی جائے۔ اس سے یقیناً کوئی بھی افسر اور ملازم نہ تو لیٹ ہوگا اور نہ ہی کوئی ڈرامے بازی کام آسکے گی اور کام بھی روزانہ کی بنیاد پر ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ایپ کو گوگل پلے اسٹور پر اپ لوڈ کر دیا جائے تاکہ ہر شہری اسے ڈاؤن لوڈ کر کے اپنے علاقے کے سرکاری ملازمین کی کارکردگی کو خود دیکھ سکے اور عوام کو یہ بھی معلوم ہو سکے کہ آج ان کی گلی میں صفائی کرنے والا کون ہے۔ کیا نام ہے اور اس وقت وہ کہاں پر ہے۔ ساتھ ہی اس ایپ میں کمپلین آپشن رکھ دیا جائے، جیسے ہی کوئی کمپلین آئے آپ کے سامنے تمام لوگوں کا ڈیٹا موجود ہوگا اور آپ اسی وقت اس کی لوکیشن اور کارکردگی کا جائزہ لے کر فوری فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس ایپ سے وزیر اعلیٰ سمیت تمام اعلیٰ افسران کو لنک کر دیا جائے، تاکہ وہ بھی لمحہ بہ لمحہ اپنے افسران کی کارکردگی کا جائزہ لے سکیں۔ اس سے اگر کوئی سیکورٹی ایشو ہوگا تو اس کا حل بھی انتہائی آسان ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ پولیس کی نقل و حرکت کو بھی مانیٹر کیا جائے کہ وہ اس وقت کہاں کہاں موجود ہے اور کیا کیا کر رہی ہے تاہم پولیس نیٹ ورک سسٹم کو عوام تک

رسائی نہ دی جائے اس سے۔یقیناً پھر معاملات خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

یہ کوئی جدید ترین ٹیکنالوجی نہیں جس کا ہم نے ذکر کیا ہے آج دنیا بھر میں اس سے کہیں گنا زیادہ جدید سسٹم کے ذریعے ادارے اپنے ملازمین کی چوبیس گھنٹے نقل وحرکت کو نوٹ کرر ہے ہیں ،چپ کے ذریعے ان کی صحت کا بھی جائزہ لیا جارہا ہے، اگر کوئی ملازم یہ کہتا ہے کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں اور وہ آفس سے غیر حاضر رہے گا تو یقین کریں وہ فوری طور پر چیک کرسکتے ہیں کہ آیا وہ بیمار ہے یا نہیں ۔لیکن ہم اتنی جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کا نہیں کہہ رہے بلکہ اس ٹیکنالوجی کے استعمال کی بات کرر ہے ہیں جو ملٹی نیشنل ادارے پاکستان میں اپنے ملازمین کے لیے استعمال کرر ہے ہیں ۔حکومت اگر واقعی سنجیدہ ہے کراچی کے مسائل کے حل میں تو جب تک وہ ٹیکنالوجی کا سہارا نہیں لے گی حالات بہتر نہیں ہوں گے کیوں کہ کراچی میں جہاں سیاسی نیم حکیم ڈاکٹروں کی کمی نہیں وہیں ہر سرکاری اداروں میں ان کے چیلوں کی بھی کمی نہیں ۔اس ٹیکنالوجی سے۔یقیناً جہاں ملازمین کی حرام خوری بند ہوگی وہیں افسران بالا کی ہڈ حرامی اور رشوت ستانی بھی ختم ہوجائے گی ۔اس سے قبل میں نے اسی طرح ایک اور بلاگ میں اسی ایپ کا ذکر کیا تھا جس میں ایپ کے ذریعے حکومت اپنی وہ اشیاء ⸗ فروخت کرسکتی ہے جو اس کے زیر استعمال نہیں ۔اس سے بھی عوام الناس کو بے حد فائدہ ہوگا۔

قانون تو بن گیا عمل کون کرے؟

کراچی دنیا کے بڑے شہروں میں شمار ہونے والا ایک شہر ہے جس کی آبادی حکومت کے مطابق تو ایک کروڑ 57 لاکھ 41 ہزار 406 بتائی جاتی ہے تاہم دیگر ذرائع کہتے ہیں کہ کراچی کی آبادی دو کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے۔ آج کراچی دنیا کے بڑے شہروں میں گیارہویں نمبر پر موجود ہے، جسے میگا سٹی کا درجہ بھی حاصل ہے۔

کراچی دنیا کی نظر میں کیا ہے اس کا ہمیں معلوم نہیں، لیکن ہماری نظر میں کیا ہے یہ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ کراچی میں حکومتی رٹ ختم ہو چکی ہے، قانون بک چکا ہے جس کی وجہ سے آج کراچی میں ڈنڈے کے زور پر قائم کیا گیا امن بھی آہستہ آہستہ جواب دے رہا ہے۔ اس شہر نا تواں میں تمام سرکاری ادارے مفلوج ہو چکے ہیں۔ کراچی گدھوں کے ہاتھوں میں ہے جو اسے روزانہ کی بنیاد پر نوچ نوچ کر ختم کر رہے ہیں، جب کہ حکومتیں اپنی سیاست کو بچانے کے لیے جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں۔

مائی کلاچی کا شہر اب منافع خوروں، لٹیروں، چور اور ڈاکوؤں کی جنت بن چکا ہے، جہاں قانون نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اسی بات کا فائدہ ہر طاقتور مافیا اٹھاتا نظر آتا ہے۔ اس شہر پر ہر قسم کی مافیا کا راج قائم ہے، جس میں منافع خور مافیا، واٹر ٹینکر مافیا، ٹرانسپورٹ مافیا، ڈیری فارم مافیا، فلور مافیا، منڈی مافیا، پرائیوٹ ایجوکیشن مافیا، تھانہ کلچر مافیا، کے الیکٹرک مافیا، واٹر اینڈ سیوریج مافیا، پارکنگ مافیا، قبضہ مافیا اور اشیاء خورونوش مافیا مافیا سمیت کئی دیگر مافیاز کے ہاتھوں کراچی والے یرغمال بن چکے ہیں جن کی آزادی کا اب کوئی تصور بھی باقی نہیں رہا۔

روزانہ کی بنیاد پر کراچی والوں کی جیب سے غیر قانونی اور ناجائز طریقے سے اربوں روپے نکالے جا رہے ہیں جن کا کوئی اعداد و شمار ریکارڈ پر موجود نہیں۔ ایک فرضی اعداد و شمار آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کراچی میں صرف دودھ مافیا ہی شہریوں سے ناجائز طریقے سے روزانہ کی بنیاد پر کروڑوں روپے وصول کر رہا ہے، ایک لیٹر دودھ کی قیمت سرکار نے 94 روپے مقرر کی ہے مگر ایک عام دکاندار تک اس قیمت کو ماننے کو تیار نہیں اور وہ فی ایک لیٹر 110 روپے اور بعض جگہوں پر 120 روپے وصول کر رہا ہے۔ اگر صرف ایک علاقے کی بات کریں تو کم از کم 1000 ہزار دکاندار روزانہ ایک ہزار روپے شہریوں سے اضافی وصول کرتا ہے تو یہ رقم دس لاکھ روپے بنتی ہے۔ صرف ایک علاقے سے دس لاکھ روپے وصول کرنے والے دکاندار ماہانہ 3 کروڑ روپے شہریوں سے وصول کر رہے ہیں۔ اسی طرح اگر پورے شہر کی دکانوں کی بات کی جائے تو یہ رقم اربوں روپے روزانہ بنتے ہیں۔ محکمہ فوڈ

اتھارٹی، کمشنر کراچی، مجسٹریٹ کے احکامات اور مختصر کارروائیاں محض بیرون ممالک اپنے آقاؤں کو خوش اور عوام کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کے مترادف ہیں۔

پانی شہریوں کی بنیادی ضرورت ہے، مگر واٹر اینڈ سیوریج بورڈ کی نااہلی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ پانی کی منصفانہ تقسیم کرنے میں مکمل ناکام ہو چکا ہے، کئی علاقوں میں چھ ماہ اور کئی علاقوں میں 6 سال گزرنے کے بعد بھی پانی فراہم نہیں کیا جاتا ہے جب کہ منظور نظر اور سیاسی اثر رسوخ رکھنے والے علاقوں میں روزانہ کی بنیاد پر پانی فراہم کر کے سڑکوں تک کو نہلا دیا جاتا ہے۔ اس غیر منصفانہ تقسیم کے پیچھے سرکاری افسران کی ٹینکر مافیا سے ملی بھگت ہے جو فی ٹینکر 3500 سے 6000 ہزار روپے وصول کر رہے ہیں۔ اگر یہاں بھی ایک ہزار گھروں کا حساب کیا جائے تو فی ٹینکر 5000 روپے کے حساب سے یہ رقم 50 لاکھ روپے روزانہ اور ماہانہ 15 کروڑ روپے بنتی ہے۔ اندازہ لگائیں یہ رقم سالانہ بنیاد پر کتنی بنتی ہوگی؟ خیر اسے بھی لاقانونیت کی ایک چھوٹی سی مثال ہی سمجھیں۔

پرائیوٹ اسکولوں کی بات کی جائے تو افسوس ہوتا ہے جب ہم سرکار کی بنائی گئیں بہترین عمارت کو بوسیدہ ہوتے دیکھتے ہیں، جہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی، جگہ جگہ گندگی کے ڈھیر اور اساتذہ کا گھر بیٹھ کر تنخواہ وصول کرنا اب اس معاشرے میں عام ہو چکا ہے۔ دوسری طرف ایک 60 گز کے مکان میں باتھ روم جتنے 6 کمرے بنا کر پرائیوٹ اسکول دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے، جہاں پڑھائی کے نام پر والدین کی جیبوں سے ماہانہ ہزاروں روپے ناجائز طریقے سے بٹور لیے جاتے ہیں، یہاں بھی اگر ہم صرف ایک ہزار اسکول والا معاملہ رکھیں اور فی اسکول میں کم از کم 200 بچوں کی تعداد رکھی جائیں، فی بچہ فیس کم از کم 1000 روپے کے حساب سے لگائیں تو یہ رقم 2 لاکھ روپے بنتی ہے، جب کہ ایک ہزار اسکول کی فیس جمع کی جائے تو یہ رقم 20 کروڑ روپے بنتی ہے۔ اندازہ لگائیں پھر اس ملک میں پرائیوٹ اسکولز کا کاروبار کیوں نہ چمکیں جب ماہانہ صرف 1000 ہزار اسکول ہی 20 کروڑ روپے کماتا ہو اور والدین کی جیب پر ڈاکا ڈالا جاتا ہو؟ یہاں ایجوکیشن افسران کی آنکھوں پر پیسوں کی پٹی پہلے ہی باندھ دی جاتی ہے اور قانون کے ہاتھ بھی نوٹوں کی گڈیوں سے بھر دیے جاتے ہیں اس لیے ہی نہ کوئی قانون ان پر لاگو ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے خلاف کوئی کارروائی آج تک عمل میں لائی گئی۔

بجلی کی بات کی جائے تو پرائیوٹ کمپنی کے الیکٹرک اس وقت پورے پاکستان میں سب سے زیادہ اندھی کمائی کھانے والا ادارہ بنا ہوا ہے۔ بجلی کی لوڈ شیڈنگ کے باوجود صارفین کی جیب سے پورے مہینے کا بل وصول کیا جاتا ہے، جس میں مختلف ٹیکسز بھی شامل ہیں۔ اوور بلنگ کا حساب کھربوں روپے اور تاریخ گزرنے کے بعد جرمانے کی رقم کا اندازہ لگانا تو بہت مشکل ہے۔ اگر یہاں پر بھی فی گھر بجلی کا بل 3000 روپے ماہانہ کے حساب سے لگایا جائے تو یہ رقم 30 لاکھ روپے بنتی ہے۔ اب اس میں 500 گھر ایسے شامل کیے جائیں جو اوور بلنگ کا شکار ہیں، ان کے یونٹ میں گڑبڑ کر کے دیکھیں تو یہ رقم فی گھر 500 روپے اضافے کے ساتھ 2 لاکھ 50 ہزار روپے بنتے ہیں۔ اسی طرح

جرمانے کی رقم بھی اگر اس میں شامل کی جائے تو یہ 5 لاکھ روپے بنتے ہیں۔ مطلب فی گھر 3000 ہزار بل دینے کے باوجود 500 روپے اضافی دے رہا ہے۔ اب اگر اس جرمانے کو کراچی کی آبادی پر تقسیم کیا جائے تو یہ رقم کھربوں روپے ماہانہ بنتی ہے۔ مگر افسوس یہاں بھی قانون اندھا ہو چکا ہے جسے نہ تو غریب کی چیخ سنائی دیتی ہے اور نہ ہی غریب کا مرنا دکھائی دیتا ہے۔ حکومت سے تو پہلے ہی توقع رکھنا فضول ہے۔

کراچی میں جگہ جگہ پارکنگ مافیا کا راج ہے، فی موٹر سائیکل 20 روپے اور فی کار 50 سے 100 روپے وصول کیے جا رہے ہیں۔ پورے شہر میں انگنت غیر قانونی پارکنگ بنائی گئی ہیں، لیکن یہاں بھی صرف ایک ہزار پارکنگ کا ذکر کیا جائے اور روزانہ ایک ہزار ہی موٹر سائیکل فیس اور ایک ہزار کار فیس کا حساب کریں تو یہ رقم روزانہ کی بنیاد پر موٹر سائیکل فیس 20 ہزار اور کار فیس ایک لاکھ روپے بنتی ہے۔ ماہانہ فیس کو جمع کریں تو موٹر سائیکل کی فیس 6 لاکھ روپے اور کار فیس 30 لاکھ روپے بنتے ہیں۔ مطلب 36 لاکھ روپے ایک ہزار پارکنگ مافیا عوام سے وصول کر رہا ہے، یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے اصل اعداد و شمار اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ لیکن یہاں ٹریفک پولیس مافیا کی جیب گرم کی جاتی ہیں اس لیے یہاں بھی لاقانونیت عروج پر ہے۔ صرف میکو سینٹر پارکنگ کا ٹھیکہ ہی ماہانہ 4 کروڑ روپے بتایا جاتا ہے۔ اس لاقانونیت میں کراچی کے شہری مکمل طور پر جکڑے جا چکے ہیں، انہیں اس طرح بے بس کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنے حق کے لیے اگر آواز بلند بھی کرنا چاہیں تو ان کی آواز پر اب کوئی کان نہیں دھرتا۔ اس لاقانونیت کے راج کو قائم کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ ہمارے مفاد پرست سیاستدانوں کا ہے جنہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ عوام کیا چاہتی ہے، انہیں اس بات سے مطلب ہوتا ہے کہ عوام کی جیب سے مال کیسے نکالا جائے اور انہیں مرنے بھی نہ دیا جائے۔ کراچی آج اس لاقونیت کی بھینٹ چڑھ چکا ہے، جسے سدھارنا شاید اب کسی کے بس کی بات نہیں۔ صرف موٹر سائیکل سوار کے چالان دیکھ لیں صرف وہی روزانہ کی بنیاد پر لاکھوں روپے بنتے ہیں، جب کہ اس مد میں لی جانے والی رشوت کا کوئی اعداد و شمار دستیاب نہیں، وہ لامحدود ہے۔

ایک اندازے کے مطابق ایک عام شہری روزانہ 500 سے 800 روپے رشوت، پارکنگ مافیا، ایجوکیشن مافیا، فلور مافیا اور ٹینکر مافیا کو دینے پر مجبور ہو چکا ہے، اور صرف 500 روپے ہی ایک کروڑ 57 لاکھ 41 ہزار 406 افراد پر ضرب دیے جائیں تو یہ رقم 8 ارب روپے کے لگ بھگ بنتی ہے۔ جب کہ وزیر اعظم صاحب خود فرما چکے ہیں کہ ملک میں 12 ارب روپے روزانہ کی بنیاد پر کرپشن ہو رہی ہے۔ اندازہ لگائیں کہ صرف کراچی والے ہی 8 ارب روپے بطور کرپشن اپنے جائز پیسے ناجائز لوگوں کو دینے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ مگر نام نہاد جمہوری حکومتوں کو اس بات سے کوئی غرض نہیں۔

کلاچی بنا کچراچی

کبھی کراچی میں لاشوں پر سیاست ہوا کرتی تھی لیکن آج کچرا سیاسی جماعتوں کا ,,ہارٹ ایشو،، بنا ہوا ہے۔ تمام سیاسی جماعتیں اس وقت کراچی میں کچرے کے ڈھیر پر کھڑی فوٹو سیشن میں مصروف ہیں اور عوام کو یہ سمجھانے پر تلی ہوئی ہیں کہ وہ کراچی کی سب سے بڑی ہمدرد ہیں۔ علی زیدی صاحب ہر وقت میئر کراچی کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں اور آج کل کراچی سے کچرا اٹھانے کی مہم بھی شروع کر رکھی ہے، لیکن کراچی کا کچرا اب ان کے گلے کی ہڈی بن چکا ہے جسے وہ نہ تو نگل سکتے ہیں اور نہ ہی اگل سکتے ہیں۔ پیپلز پارٹی اپنا دامن جھاڑ کر ایک طرف ہو چکی ہے اور دیکھو، خاموش رہو کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایک پرہجوم پریس کانفرنس کے ذریعے اپنے ہونے کا پتہ دیتی رہتی ہے۔

کراچی اس وقت ایک ڈسٹ بن کی شکل اختیار کر چکا ہے جہاں ہر طرف کچرے کے انبار نظر آتے ہیں۔ چین کی کمپنی بھی اپنا ہاتھ اٹھا چکی ہے، بقول چیف کمشنر کے ان کا معاہدہ ختم کر دیا گیا ہے۔ بہر حال اندرونی کہانی جو بھی ہے تاہم حقیقت میں کراچی کا کچرا آج بھی وہیں ہے جہاں پہلے موجود تھا۔ کراچی یا کچرا گھر کے حوالے سے میرا ایک بلاگ 2015ء ؁ میں ایکسپریس میں شائع ہو چکا ہے اور اس وقت بھی یہی حالات تھے، میئر صاحب فنڈز کا رونا روتے نظر آ رہے تھے اس وقت بھی ہم نے کہا تھا کہ اگر میئر صاحب اور ان کی ٹیم کے پاس اختیارات اور فنڈز نہیں تو پھر وہ اپنی سیٹوں سے کیوں چپکے ہوئے ہیں۔ ایسی کون سی مجبوری ہے کہ وہ آج چار سال بعد بھی اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار نہیں۔

مصطفیٰ کمال کو ایک دن کا اختیار دینے کے بعد اگلے ہی روز انہیں یہ کہہ کر معطل کر دیا کہ وہ بدتمیزی پر اتر آئے تھے۔ اس سیاسی چپقلش میں کس کا سیاسی قد بڑھا اور کس کا گھٹا یہ تو انہیں ہی معلوم ہوگا لیکن عوام کا مسئلہ جوں کا توں ہی رہا۔ مصطفیٰ کمال نے چارج سنبھالنے کے بعد رات دو بجے ایک پرہجوم پریس کانفرنس کے دوران کہا کہ میں نے مختلف ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ افسران کو بلایا ہے مگر آف دی ریکارڈ بتا رہا ہوں کہ انہوں نے یہ کہہ منع کر دیا کہ میئر صاحب نے آنے سے منع کر رکھا ہے، جس پر انہوں نے میئر کراچی کو فون کیا لیکن وہ بھی ریسیو نہیں کیا گیا۔ مصطفیٰ کمال کے مطابق وہ دن رات کام کام اور کام کرنے والے شخص ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں کہ میرا باس میرا مخالف جماعت کا ہے، میں کام کرنے کے لیے تیار ہوں آپ بھی تیار رہیں۔ مصطفیٰ کمال کی ایک اچھی بات یہ بھی لگی کہ جب کراچی کے بڑے جاگیں گے تو

کراچی والے سوئیں گے۔ اگر کراچی کے کرتا دھرتا ہی سوتے رہیں تو پھر مجبوراً عوام کو جاگنا پڑتا ہے۔
ایک اندازے کے مطابق صرف ساؤتھ میں ہی 1200 ملازمین کی تنخواہ سولڈ ویسٹ مینجمنٹ کے کھاتے سے نکل رہی ہے اور یہ بل ہر مہینے عوام کے نام پر کٹتا ہے۔ سینکڑوں مشینری میونسپل کارپوریشن کی عمارتوں میں گل سڑ گئی ہیں لیکن ان کا ہر مہینے مینٹنس، فیول اور روزانہ کے اخراجات سرکاری خزانے سے نکل رہے ہیں۔ ویسٹ زون میں بھی کم وبیش یہی صورت حال ہے اور وہاں بھی اتنی افرادی قوت موجود ہے جن کو ماہانہ تنخواہ ادا کی جارہی ہے۔ ویسے سڑکوں اور گلی محلوں میں کبھی ان خاکروبوں کو نہیں دیکھا جاتا لیکن اگر ان کی دو ماہ کی تنخواہ بند کردی جائے تو ہزاروں کی تعداد میں یہ لوگ پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کرنے پہنچ جاتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتا اس وقت اتنے لوگ کہاں سے آجاتے ہیں جبکہ ڈیوٹی پر چند سو افراد ہی دیکھنے کو ملتے ہیں اور وہ بھی سرسری صفائی ستھرائی کرکے اپنا کام نپٹا کر چلتا بنتا ہے۔ تمام سرکاری ملازمین کا یکساں ٹائم ٹیبل مقرر ہے مگر لیکن بارہ بجے کے بعد کوئی بھی خاکروب اور سولڈ ویسٹ مینجمنٹ کا بندہ سڑک یا گلی محلے میں نظر نہیں آتا۔

اربوں روپے کی ہیر پھیر والے ادارے کی سربراہی دینے کے بعد میئر کراچی کو فوراً خیال آگیا کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوگئی ہے، اس لیے صبح جب نشہ ہرن ہوا تو پہلی فرصت میں مصطفیٰ کمال کو معطل کرنے کا دوسرا نوٹیفیکیشن جاری کردیا۔ انہیں شاید اس بات کا بھی احساس ہوگیا تھا کہ ان کے احکامات قانون سے متصادم ہیں۔ اس لیے بہانہ یہ بنایا کہ مصطفیٰ کمال بدتمیزی پر اتر آئے تھے۔ اگر آپ کو واقعی دکھ اور تکلیف ہے کراچی کی تو آپ اس بات کو نظرانداز بھی کرسکتے تھے اور تین ماہ مصطفیٰ کمال کو بھی آزما لیتے۔ یا پھر شاید میئر کراچی کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ مصطفیٰ کمال پرانے کھلاڑی ہیں اور انہیں ہر راستے کا علم ہے، اگر انہوں نے واقعی تین ماہ میں کراچی کو کچرے سے پاک کردیا تو پھر ان کی رہی سہی عزت بھی مٹی میں مل جائے گی۔ بات جو بھی ہو مگر میئر کراچی نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماردی ہے۔

کراچی کا کچرا اٹھانا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن بغیر کسی منصوبہ بندی اور بغیر متبادل نظام فراہم کیے بغیر تمام سیاسی جماعتوں کی یہ مشق بیکار ثابت ہونے والی ہے۔ بلدیہ ٹاؤن میں جہاں جہاں سے دو روز قبل ایم پی اے ملک شہزاد اعوان نے کچرا صاف کروایا محض دو روز بعد ہی وہاں دوبارہ کچرے کے انبار لگنا شروع ہوگئے ہیں۔ ان کی مشقت پہلی بار میں ہی ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح علی زیدی صاحب دو درجن بالٹیاں اور دو درجن وائپر لے کر کراچی کو صاف کرنے کی مہم سر کرنے کی ناکام کوششوں میں مصروف ہیں، انہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں کہ مسئلہ کچرا اٹھانے کا نہیں بلکہ کچرا ڈالنے کے لیے جگہ درکار ہے۔

ہمارے یہاں ایک اصول یہ بھی ہے کہ جہاں کوئی خالی پلاٹ نظر آئے سمجھوں وہ سرکاری کچرا کنڈی ہے۔ چند روز میں ہی وہاں ٹنوں کے حساب سے کچرا جمع ہوجاتا ہے۔ یہ بدتہذیبی کی اعلیٰ مثال ہے جسے لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بے شک کچرا اٹھانا متعلقہ ادارے کا کام ہے لیکن کچھ ذمے داریاں عوام الناس کی بھی ہیں۔ معاشرہ عوام سے بنتا ہے تاکہ

اداروں سے،اوراس وقت پاکستان کامعاشرہ بدتہذیبی کی دوڑ میں سب سے اول نمبر پرموجود ہے۔ہماراجہاں دل کرتا ہے وہاں کچرا پھینک دیتے ہیں،آلائشوں کے لیےایک ہرجگہ باقاعدہ ایک پوائنٹ بنائے گئے تھے لیکن وہاں ایک بھی آلائش دیکھنےکونہیں ملی۔یہی لوگ جوآج کچرا کچرا کی دہائی دے رہے ہیں کل تک خودہی اس کچرے اورگندگی کے اسباب پیدا کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ہم اپنے بچوں تک کوتمیز سکھانے کی جرات نہیں کرپارہے ہیں،ہمارا بچہ اگر کچھ کھا کرریپر گلی میں کہیں بھی پھینک دیتا ہےتو اسے منع کرنے کے بجائے اس کی یہ کہہ کرحوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ کچرا یہیں پھینکو گھر لے جانے کی ضرورت نہیں۔ایسے میں بچہ کچراباہر جہاں اس کا دل کرے گا پھینکے گا،ہم اپنی ذمے داریوں سے بری الذمہ ہونا چاہتے ہیں اورتمام چیزیں اداروں اور منتخب نمائندوں کےسرتھوپنا چاہتے ہیں۔جوسراسر غلط ہے۔

ملک شہزاداعوان اپنے حلقے کےساتھ ساتھ دیگرحلقوں میں بھی کام کررہے ہیں۔جتنے وسائل ان کے پاس ہیں وہ ان کا بخوبی استعمال کررہے ہیں،تاہم یہ کام ان کے کرنے کےنہیں ہیں۔ایک منتخب نمائندے کا کام قانون سازی کرنا ہوتا ہے،اسمبلی میں عوام کےحقوق پربات کرنا اورانہیں ریلیف فراہم کرنا ہوتا ہے،لیکن یہاں عوام ہرکام ان کے ذمے ڈال رہی ہے،چیئرمین اوروائس چیئرمین خاموشی سے مزے لے رہے ہیں اورانہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ علاقے میں کیاہورہاہے۔جب کہ کےایم سی کی جانب سےانہیں باقاعدہ 5 لاکھ روپے ماہانہ ادا کیے جاتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ یوسی کےاپنے بھی کئی ذرائع آمدن ہیں،اس کے باوجود گلی محلے میں بندگٹر کھلوانے کے لیےلوگ یاتو چندہ کرتے نظرآتے ہیں یاپھرایم این اےاورایم پی اے کاانتظارکرتے دکھائی دیتے ہیں۔

عوام کواپنا بھی فرض ادا کرنا ہوگا۔ورنہ میرےکراچی اورعوام میں کوئی فرق نہیں رہے گا۔

منشیات

پاکستان میں منشیات کا استعمال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اس منشیات میں زیادہ تر افراد شراب ہیروئن، چرس، افیون بھنگ، کرسٹل آئس صمد بانڈ اور دیگر سکون بخش ادویات شامل ہیں منشیات کے عادی افراد میں خواتین کی تعداد 22 لاکھ سے زائد ہو چکی ہے۔

بی بی سی کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان چرس کے استعمال میں دوسرے نمبر پر آ چکا ہے جب کہ اسی طرح دیگر نشے کو دیکھا جائے تو سرنج کا استعمال پاکستان میں دوسرے نمبر پہ ہے۔ایک خبر رساں ادارے کے مطابق پاکستان غیر قانونی منشیات اسمگلنگ کا ایک اہم روٹ بھی تصور کیا جاتا ہے۔

اس منشیات سے جہاں دوسری بیماری معاشرے میں پھیل رہی ہیں وہیں کینسر ایڈز اور ہیپاٹائٹس میں بھی دن بدن اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے۔پاکستان کا دارالحکومت اسلام آباد آئس کے معاملے میں سرفہرست ہے۔خبر رساں ادارے کے مطابق آئس کا نشہ کرنے والا ایک عجیب وغریب سرور میں مبتلا رہتا ہے جس کی نیند بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے اس دوران نہ اسے کھانے کا کوئی ہوش رہتا ہے اور نہ ہی پینے کا صرف جاگتے رہنا ہی اس کی عادت بن جاتی ہے جو ایک انتہائی خطرناک صورت حال کی طرف پیش قدمی ہوتی ہے۔ کیمیائی نشے کا استعمال جہاں دماغ پر وار کرتا ہے وہیں دانت بھی خراب کر دیتے ہیں جس کے باعث منہ میں انفیکشن بڑھ جاتا ہے جو بعد ازاں کینسر کی روپ میں سامنے آتا ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق آئس کی تیاری میں استعمال ہونے والے مخصوص کیمیکلز پاکستان میں باآسانی مل جاتے ہیں اور یہ اجزاء پاکستان بھر میں دستیاب ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے ہیں، جن پر کوئی پابندی عائد نہیں اور نہ ہی لگائی جا سکتی ہے۔آئس کے استعمال کی روک تھام میں ایک اور رکاوٹ یہ بھی ہے کہ اس کی فروخت روایتی انداز میں نہیں کی جاتی۔اس کو بیچنے کے لیے آرڈر ملنے پر سپلائی ہوم ڈیلیوری کے ذریعے کی جاتی ہے۔دوسری طرف کرسٹل میتھ یا آئس کے استعمال سے نیند کے غائب ہو جانے، طاقت کے احساس، اور خوشی کے جذبات کے ساتھ ساتھ متعلقہ فرد کے جارحانہ رویے میں شدت بھی آ جاتی ہے جبکہ بلڈ پریشر میں اضافہ اور ہارٹ اٹیک بھی ان منشیات کے استعمال کے طویل المدتی نتائج میں شامل ہیں۔

سگریٹ کا بے دریغ استعمال پاکستان میں موت بانٹنے کا سبب بننے لگا ہے۔ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن اور گلوبل یوتھ ٹوبیکو کے سروے کے مطابق اس وقت 13.3 فیصد لڑکے اور 6.6 فیصد لڑکیاں جن کی اوسط عمر 13 سے 15 سال کے

درمیان ہیں تمباکو نوشی کے استعمال میں مبتلا ہیں۔ یہ ایک انتہائی خوفناک تعداد ہے۔ اسی سروے کے مطابق پاکستان میں روزانہ 274 افراد تمباکو نوشی کے باعث مر رہے ہیں' جب کہ ایک لاکھ 60 ہزار افراد ہر سال تمباکو نوشی کے باعث خطرناک بیماریوں کا شکار ہو کر لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ اسی طرح سگریٹ زدہ ماحول میں رہنے والے صرف 0 4 ہزار افراد پاکستان جب کہ 6 لاکھ افراد پوری دنیا میں سالانہ موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

پاکستان کا شمار دنیا کے ان 15 ممالک میں ہوتا ہے، جہاں تمباکو کی پیداوار اور استعمال سب سے زیادہ ہے۔ غیر سرکاری تنظیم' نیٹ ورک فار کنزیومر پروٹیکشن' کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ملک بھر میں پانچ لاکھ سے زائد دوکانیں اور پان کے کھوکھوں پر سگریٹ باآسانی دستیاب ہے۔ سب سے تشویشناک بات یہ ہے کہ ملک میں روزانہ تقریباً 1200 بچے سگریٹ نوشی کا آغاز کر رہے ہیں یعنی تمباکو نوشی کی جانب قدم بڑھانے والے ہر پانچ میں سے دو کی عمر دس سال ہے۔

گزشتہ دنوں اسپارک کے تحت منعقدہ ورکشاپ سے خطاب کرتے ہوئے کاشف مرزا نے تمباکو اور تمباکو نوشی کی ممانعت اور تمباکو نوشی نہ کرنے والے افراد کے تحفظ سے متعلق آرڈیننس 2002 پر حقائق فراہم کیے جس میں ایسے اقدامات شامل ہیں جن میں تمباکو نوشی میں مبتلا افراد کو عوامی مقامات پر تمباکو نوشی کی ممانعت، تعلیمی اداروں میں تمباکو کی مصنوعات کی رسائی اور 18 سال سے کم عمر افراد پر سگریٹ فروخت کرنے پر پابندی عائد کی گئی ہے۔ کاشف مرزا کے مطابق خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف قانون کے تحت 18 سال کے دوران کوئی ایک بھی شکایت درج نہیں کی گئی جو لمحہ فکریہ ہے۔ جب کہ 2016 سے 2019ء تک تمباکو پر کم ٹیکسز کے باعث 77.85 بلین روپے کا نقصان ہو چکا ہے۔

صدر کراچی پریس کلب امتیاز فاران کے مطابق نشہ کی ابتدا سگریٹ نوشی سے ہوتی ہے۔ امتیاز فاران کا کہنا ہے کہ ہم سول سوسائٹی کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں تاکہ تمباکو کی مصنوعات پر ٹیکس بڑھانے کے ساتھ نوجوانوں میں سگریٹ نوشی کی عادت کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔ صحت مند طرز زندگی کے لئے بچوں کو سگریٹ فروخت کرنے کے خلاف قوانین موجود ہیں۔ اچھی صحت کے لئے تمباکو نوشی کی عادت کو کم کریں اور صحت پر اٹھنے والے اخراجات کو کم کریں۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کی چیئر پرسن پروفیسر ڈاکٹر فرح اقبال کے مطابق نکوٹین کے علاوہ بھی سگریٹ میں بہت سے مضر اجزاء ہیں۔ اس میں 4000 کیمیکلز ہوتے ہیں جس میں 50 کے متعلق پتا چلا ہے کہ وہ مضر نوعیت کے ہیں، مثال کے طور پر اس میں کاربن مونو آکسائیڈ ہوتا ہے جو کار سے خارج ہونے والے دھویں میں ہوتا ہے، بیوٹین لائٹر کے پانی میں شامل ہوتا ہے اور آرسینک، امونیا اور میتھانول راکٹ کے ایندھن میں استعمال ہوتے ہیں۔ ایک نوعمر بچے کا دماغ جو ابھی نشوونما کے مرحلے میں ہوتا ہے اسی دوران نکوٹین کا استعمال اس کو متاثر کرتا ہے اور نوجوانوں کے بچپن کے دوران دماغ کے کام کرنے کی صلاحیت میں تبدیلی آتی ہے جس سے وہ زندگی بھر نشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے

اوران کے رویوں اوررجحانات پر دوررس مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔پروفیسر فرح اقبال کے مطابق تمباکونوشی کئی ایک خطرناک رویوں کاباعث بھی ہے۔نیند کادورانیہ کم ہونا' دماغ کی امپریشن کاتبدیل ہونا'ہیپر ہائی ہونا'ڈپریشن کا خطرناک حدتک بڑھ جانا' بےچینی کاہونا' کنفیوزیشن کابڑھنا' کام میں دشواری کا سامنا کرنے سمیت چڑچڑاپن' جارحیت' دماغ کے وائٹ سیل کم ہونے سے ذہنی کمزوری اور بھولنے کی عادتیں شامل ہوجاتی ہیں۔اس کے بعد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی چلی جاتی ہے۔ڈاکٹر فرح اقبال کے مطابق 13-15 سال کی عمر کے 100 بچوں میں سے 34 بچے اس تمباکونوشی سے متاثر ہورہے ہیں۔

اسپارک SPARC کی منیجر شائل وحید کے مطابق ان مسائل کے حل کے لیے میڈیا کا کردار بہت اہم ہے۔ہم سماجی مسائل اورحقائق پرمبنی رپورٹس کے لیے کوشاں ہیں اور ساتھ ہی مزید نشستیں میڈیا کے ساتھ منعقد کریں گے اورقانون سازاورقانون نافذ کرنے والےاداروں کودرست کارروائی کے لیے زور ڈالیں گے۔

خبررساں ادارے کی رپورٹ کے مطابق پبلک ہیلتھ پروفیشنل ڈاکٹر سیمین خان کا کہنا ہے کہ نوجوانوں میں نشے کے بڑھتے ہوئے رجحان کی سب سے بڑی وجہ بےروزگاری ہے، جس کی وجہ سے وہ ڈپریشن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ابتدا سگریٹ سے ہوتی ہے، پھرچرس کی طرف جاتے ہیں، پھرانجیکشن کا استعمال ان کوزیادہ مزہ دیتا ہے اورآہستہ آہستہ زیادہ سے زیادہ مزے کی تلاش میں وہ ہیروئن اوردیگرنشوں میں ڈوبتے چلے جاتے ہیں۔دس سال یااس سے بھی کم عمر کےایسے نابالغ بچے جوعموماً فیکٹریوں میں یاپٹرول اسٹیشنوں پرکام کرتے ہیں، وہ اپنے ماحول کی وجہ سے صمد بانڈ یا پٹرول جیسے سستے لیکن خطرناک نشے کے عادی ہوجاتے ہیں۔پھرایک بار جب انہیں ایسے نشے کی عادت ہوجاتی ہے تو وہ دیگرمنشیات بھی استعمال کرنے لگتے ہیں۔

منشیات کے بے دریغ استعمال میں قانون کس حدتک قصوروار ہےاس حوالے سے ایک پولیس افسر کا کہنا ہے کہ ہم جتنی بھی کوشش کرلیں، آخرمیں بدنامی ہماری ہی ہوتی ہے۔تاہم یہ بات سب کومعلوم ہے کہ پولیس کے پاس جدید سہولیات' بجٹ اوراختیارات کافقدان ہے۔پولیس افسر کے مطابق فوج کا جتنا بجٹ ہے اگراس کا آدھا بھی پولیس کو دے دیا جائے تو وطن عزیز کواس لعنت سمیت دیگرجرائم سے پاک کرسکتے ہیں۔خبررساں ادارے ڈوچے کی رپورٹ کے مطابق معاشرے میں بدعنوانی بھی بہت بڑا مسئلہ بنا ہوا ہے، پولیس چھاپے مارکرمجرم اورمنشیات پکڑتی ہے تو اوپر سے فون آجاتا ہے کہ انہیں چھوڑدو۔منشیات فروشوں کے بااثرشخصیات سے رابطے ہوتے ہیں۔جس کے باعث پولیس اکثر بےبس ہوجاتی ہے۔تعلیمی اداروں میں منشیات فروشی کے بہت سے واقعات میں یونیورسٹیوں اورکالجوں کا عملہ بھی ملوث پایا گیا ہے۔پاکستان سے منشیات کی لعنت کوختم کرنے کے لیے مکمل منصوبہ بندی، کافی وسائل اورپختہ عزم کی ضرورت ہے، جس دوران کوئی بھی بااثرمجرم قانون کی گرفت سے دورنہ ہے۔

2013ء کےایک سروے کے مطابق پاکستان میں تقریباً 77 لاکھ افرادمنشیات استعمال کرتے ہیں۔ان میں اکثریت

نوجوانوں کی ہے، کیونکہ پاکستان کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے، جہاں آبادی کے تقریبا نصف حصے کی عمر اٹھارہ سال سے کم ہے۔

پاکستان میں فوڈ اتھارٹیز تو ہیں، مگر وہاں ریسرچ کا کوئی انتظام نہیں۔ سرکاری سطح پر منشیات کے عادی افراد کی ’ڈی ٹاکسیفیکیشن‘ کی سہولیات دستیاب ہی نہیں۔ اگر یہ سروسز ہیں بھی تو نجی شعبے میں، جو بہت مہنگی ہیں۔ ایک عام پاکستانی خاندان اپنے کسی فرد کے لیے ان اخراجات کو برداشت کرنے کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ حکومت کی گزشتہ ڈرگ کنٹرول پالیسی کیا تھی، اس کا بھی جائزہ لیا جانا چاہیے کہ اس کی خوبیاں اور خامیاں کیا تھیں۔ پھر موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اس پالیسی میں ترامیم کی جانا چاہئیں۔" پاکستان میں نشے کے عادی افراد کو تلاش کرنے کے لیے آپ کو کوئی بھاگ دوڑ نہیں کرنا پڑتی۔ ایسے لاکھوں پاکستانی بھکاریوں کی طرح آپ کو ہر شہر میں جگہ جگہ نظر آئیں گے، دو سے تین سو روپے کے عوض ہیروئن کی پڑیا خریدنے والے۔ پاکستان میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا نشہ چرس ہے، جو آسانی سے مل جاتی ہے اور مقابلتاً سستی بھی ہے۔ آئس پاکستان میں زیادہ تر ایران سے لائی جاتی ہے، جو خالص حالت میں بہت مہنگی ہوتی ہے لیکن منشیات کا کاروبار کرنے والے اکثر اس میں ملاوٹ کر کے بیچتے ہیں، جو مختلف طرح کے زہر یکجا کر دینے والی بات ہے۔

2002ء میں تمباکو نوشی کے خلاف بنایا گیا قانون سیکشن 5 کے مطابق پبلک مقامات پر سگریٹ نوشی منع ہے جس کی کم سے کم سزا ایک ہزار روپے جرمانہ مقرر ہے۔ سیکشن 6 کے مطابق پبلک ٹرانسپورٹ’ کوچ‘ مزدا‘ ٹرین‘ ہوائی جہاز میں تمباکو نوشی ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کی سزا ایک ہزار روپے سے 5 ہزار روپے تک جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ سیکشن 7 کے مطابق تمباکو نوشی کے حوالے کسی بھی پلیٹ فارم مثلاً اخبارات‘ میگزین‘ رسائل‘ جریدہ‘ ٹی وی چینل اور سوشل میڈیا سمیت بینرز اور پمفلٹ کی صورت میں بھی پبلسٹی ممنوع قرار دی گئی ہے۔ خلاف ورزی پر 5 ہزار روپے یا اس سے زائد کا جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔ سیکشن 8 کے مطابق اٹھارہ سال سے کم عمر کو سگریٹ فروخت کرنا ممنوع ہے جس کی سزا ایک لاکھ روپے جرمانہ اور تین ماہ قید درج ہے۔ اسی طرح سیکشن 9 کے مطابق سرکاری‘ نیم سرکاری اور پرائیوٹ ایجوکیشن انسٹیٹیوٹ کے پچاس میٹر کے دائرے میں کوئی بھی پان کا کھوکھا‘ کیبن منع ہے۔ سیکشن 10 کے مطابق پبلک سائن بورڈ پر پبلسٹی پر پابندی ہے۔ سیکشن 11 کے تحت تمباکو نوشی کی ماڈلنگ کے لیے عمر چالیس سال سے زائد ہونی چاہیے۔ تاہم افسوس کی بات یہ ہے کہ 2002 سے اب تک اس قانون کی کھلم کھلا دھجیاں بکھیریں جا رہی ہیں اور سونے پر سہاگہ یہ کہ ان اٹھارہ سالوں میں ایک بھی مقدمہ درج نہیں کیا گیا۔ جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قانون کا نفاذ معاشرے پر کتنا موثر ہے۔

عوام اور ٹیکس

کئی روز سے ذہن میں مسلسل ایسے خیالات آ رہے تھے کہ جس کی وجہ طبیعت میں اضطراب و بے چینی کے ساتھ ساتھ راتوں میں آنکھوں سے نیند بھی کچھ روٹھ سی گئی تھی، اس بے خوابی میں ہر بار اٹھ کر قلم اٹھاتا اور لکھنے کا ارادہ باندھتا پھر ارادہ ترک کر دیتا، متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ قلم اٹھایا کچھ سطریں سپرد قرطاس کیں پھر جی میں آیا اور ورق پھاڑ کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیئے۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سے شروع کروں اور کہاں پر ختم! ۔ معاً جھپا کا سا ہوا، ایک خبر نظروں کی سامنے آئی اور میری تمام تر الجھن ختم ہو گئی۔ پاکستان میں امیر ترین لوگوں کی فہرست مرتب کرنا بہت آسان کام ہے یہ وہ لوگ ہیں جو ٹیکس بھی دیتے ہیں، ظلم بھی سہتے ہیں، دن رات محنت بھی کرتے ہیں، وہ وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں ایک وقت کی روٹی بھی کھانا بھول جاتے ہیں۔ یہ امیر ترین لوگ پاکستان کے ہر گلی محلے میں بستے ہیں، منتخب ہونے کے بعد یہ لوگ صرف حکمرانوں کو ہی نظر نہیں آتے۔

آیئے آج آپ لوگوں کو ان سے ملواتے ہیں۔ شاید ووٹ مانگنے والے حکمرانوں کو بھی کچھ نظر آ جائے۔

نمبر (دس)

بلدیہ اور سائٹ ٹاؤن کی حدود میں ایک آٹھ سالہ بچی گھر میں غربت کی وجہ سے واٹر ٹینکر چلانے پر مجبور ہو گئی۔ والد کو فالج کا اٹیک ہوا تو گھر میں کمانے والا کوئی نہیں بچا۔ اس آٹھ سالہ ننھی پری خوشی نے گھر کی ذمے داری اپنے کمزور سے کاندھوں پر اٹھانے کا فیصلہ کیا اور ایک بڑی گاڑی کا اسٹیرنگ سنبھال کر اپنے گھر کو سنبھالا دینے لگی۔ ننھی پری شیر شاہ سے رشید آباد تک واٹر ٹینکر چلا کر 500 روپے روزانہ کی بنیاد پر کما رہی تھی جو ماہانہ 15000 روپے بنتے ہیں۔ جس میں سے گھر کا کرایہ، والد کا علاج، راشن، بجلی اور گیس کا بل بھی اسی میں سے ادا ہوتا ہے۔ باقی بچتا کیا ہو گا یہ حساب آپ خود لگا لیں۔ امیروں کی فہرست میں یہ ننھی پری دسویں نمبر پر موجود ہے۔ خوشی کے حوالے سے کئی کہانیاں سامنے آئیں ہیں مگر آخری ویڈیو میں اس نے جو کہا وہ حکمرانوں کے لیے کافی ہے۔

نمبر (نو)

پانچ سالہ ننھا فرہاد خان اسکول ٹائمنگ پر اٹھتا ضرور ہے مگر آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ یہ ننھا فرہاد اسکول جانے کے بجائے اسکول کے باہر ٹافیاں، پاپڑ اور ایک روپے والا بسکٹ ایک تھالے میں سجائے اسکول کے گیٹ کے باہر آ کر بیٹھ جاتا ہے اور ہر بچے کو اسکول میں جاتے وقت اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں بے پناہ حسرتیں لیے بس دیکھتا رہتا ہے۔

جب کوئی بچہ ضد کر کے ننھے فرہاد سے چیز لینے کی ضد کرتا تو اس کی آنکھوں میں چمک آجاتی کہ چلو کوئی تو خریدار آیا، اور اگر اس بچے کے ساتھ جو اسے اسکول چھوڑنے آیا ہے وہ اسے چیز نہ لے کر دے تو اس معصوم کا دل بجھ سا جاتا ہے۔
ننھے فرہاد کے گھر کمانے والا اس کا بڑا بھائی جو محض 15 سال کا ہے اور ایک موٹر مکینک کے پاس کام کرتا ہے۔ماں گھر میں سلائی کر کے گھر کی گاڑی چلانے میں ہاتھ بٹاتی رہتی ہے۔اس گھر کے اخراجات اور آمدن کا حساب آپ لگا نا بھی آپ کی ذمہ داری ہے۔محکمہ انکم ٹیکس اس گھر پر نظر رکھے، یہاں سے بہت کچھ قومی خزانے کا پیٹ بھرنے کے لیے مل سکتا ہے۔یہ فیملی امیر ترین فہرست میں نویں نمبر پر ہے۔

نمبر (آٹھ)

ایک بیوہ ماں کے بچے اسکول میں پڑھ رہے ہیں، والد کے گزرنے جانے کے بعد ماں نے محنت مزدوری کر کے ان بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔گھر کرایہ کا ہے جس میں گیس بجلی کے بل ملا کر ماہانہ 12 ہزار روپے اس مد میں نکل جاتے ہیں، بچے سرکاری اسکول میں پڑھ رہے ہیں لیکن اس کی سالانہ فیس پرائیوٹ اسکول کے برابر ہے۔بچوں کے روزانہ آنے جانے کا کرائے کا حساب الگ ہے، اس بیوہ عورت کو مدد کے نام پر صرف جھوٹ اور دلاسے ملتے ہیں۔پورا دن فیلڈ میں سخت محنت کے بعد گھر آکر جب تھکان سے لیٹتی ہے تو چند منٹوں بعد دوبارہ سلائی کڑھائی والے بچوں کو ٹیوشن دینے بیٹھ جاتی ہے یہ سوچ کر کہ جب بچے اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں گے تو تب آرام کرلے گی۔
لیکن یہ وقت ابھی فی الحال بہت دور ہے، تب تک اسے دن رات محنت کرنا ہوگی۔اور ایک بات یہ بھی ہے اس بیوہ کو حکومت وقت کی جانب سے نہ تو کوئی اسکیم ملی ہے اور نہ ہی اس کے پاس بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کارڈ ہے۔جس جس پارٹی نے کارڈ اور مدد کرنے کا وعدہ کیا بدلے میں بہت بڑی قیمت بھی مانگی جو اس عورت کے بس کی بات نہیں تھی۔اس خاتون کے گھر کا حساب کتاب بہت سادہ سا ہے۔جس میں فقط قرضہ ہی قرضہ ہے۔یہ گھرانہ ایف بی آر والوں کیلیے انتہائی مفید ہے، اس بے سہارا خاتون کا نمبر فہرست میں آٹھواں ہے۔

نمبر (سات)

پینسٹھ سالہ گلاب خان جس کی عمر آرام کرنے کی ہے مگر وہ رنگل چوک پر کمپیوٹر مارکیٹ میں جگ میں شربت ڈالے گھومتا رہتا ہے، کبھی کسی دکان پر موجود کسٹمرز سے پوچھتا ہے کہ بھائی صاحب ٹھنڈا شربت پیا ہے صرف دس روپے کا گلاس ہے، کبھی راہ چلتے راہگیروں سے کہتا ہے شربت پی لو، صرف دس روپے کا گلاس ہے۔یہ امیر ترین بزرگ روزانہ بمشکل دو سے ڈھائی سو روپے کما رہا ہے جس میں سے یہ اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پال رہا ہے، گھر میں کمانے والا کوئی بیٹا نہیں جو سہارا بن سکتا۔اللہ پاک نے صرف بیٹیوں سے نوازا ہے اب بیٹیاں کتنی ہیں یہ گلاب خان نہیں بتایا، کہتا ہے پٹھان آدمی ہوں کیوں بتاؤں کہ کتنی بیٹیاں اور کتنی شادی شدہ اور کتنی کنواری ہیں۔اللہ پاک نے مجھے سلامت رکھا ہے محنت کر رہا ہوں، تنگی اور پریشانیاں ضرور ہیں مگر شکر ہے میرے رب کا کسی کا محتاج نہیں، اللہ کے کچھ نیک بندے ہیں

جو مدد کر دیتے ہیں مگر اتنی نہیں کہ سب کچھ پورا ہو جائے۔ گلاب خان کی ایک ہاتھ کی انگلیاں کٹی ہوئیں ہیں جس کی وجہ سے وہ بھاری کام نہیں کر سکتا۔ شاید یہی وہ مجبوری ہے جس کی وجہ سے گلاب خان شربت بیچ کر اپنا کنبہ چلا رہا ہے۔ اس کی کمائی اور منافع کا حساب کتاب لگا کر ایف بی آر فوری ٹیکس لیٹر اس کے گھر پر بھیج دے۔ گلاب خان کا نمبر فہرست میں ساتواں ہے۔

نمبر (چھ)

کراچی کا رکشہ ڈرائیور جس کا نام تو معلوم نہیں ہو سکا مگر اس کی ویڈیو نے سوشل میڈیا پر سب کو رونے پر مجبور کر دیا۔ اس رکشہ ڈرائیور نے سڑک کے کنارے اپنے رکشے کو آگ لگا دی۔ قریب ہی کھڑا ایک شخص جو اس وقت ویڈیو بنانے میں مصروف تھا اس نے رکشہ ڈرائیور سے جب سوال کیا کہ آپ نے رکشہ کیوں نذر آتش کر دیا۔ جس پر رکشہ ڈرائیور نے جواب دیا آج بھی سی این جی بند ہے، کچھ کمائی نہیں ہوئی اور پھر زار و قطار روتے ہوئے بس اتنا کہا کہ گھر کیا لے کر جاؤں، بچے کھانا مانگتے ہیں، مالک مکان کرایہ مانگتا ہے، کریانہ والا ادھار راشن نہیں دے رہا، گیس، بجلی کے بل واجب الادا ہیں، یہ سب کہاں سے پورے کروں۔ اس کے دکھ کا تصور تو وہ شخص کر سکتا ہے جو خود صاحب اولاد ہو۔ لیکن اس کے دکھ کا مداوا کرنا حکومت وقت کی بس کی بات نہیں۔ ایف بی آر والوں کو فوری طور پر اس کے گھر ریڈ مارنی چاہیے تاکہ بچا کچا ٹیکس کی مد میں لے کر قومی خسارے کو پورا کیا جا سکے۔ اس امیر ترین رکشہ ڈرائیور کا فہرست میں نمبر چھٹا ہے۔

نمبر (پانچ)

اللہ بخش، جسے بابا بخشو کہتے ہیں۔ سڑک کنارے کسی وقت فروٹ کی ریڑھی لگا کر اپنے گھر کا چولہا جلایا کرتا تھا۔ پھر کچھ یوں ہوا کہ معزز عدالت کو تبدیلی کا خیال آیا اور اس نے پورے شہر کو کھاڑ پچھاڑ کرنے کی ہدایت کر دی۔ شاہی افسران نے بھی حکم بجا لاتے ہوئے رسمی کارروائیاں کر کے اعلیٰ عدلیہ کو خوش کر دیا۔ لیکن ٹھہریے۔ ابھی کہانی باقی ہے۔ پھر اچانک کے ایم سی کے افسران کو ریڑھیاں نظر آنا شروع ہو گئیں، ٹھیلے والے آنکھوں پر کھٹکنے لگے اور پولیس کو بھتہ کم ہونے کا افسوس ستانے لگا تو پھر انہوں نے ایک ہی پلیٹ میں کھانے کا سوچا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فی ٹھیلا ماہانہ 5 ہزار روپے جو دے گا وہ ہی اپنا ٹھیلا لگائے گا باقی کسی کو اجازت نہیں۔ اب بابا بخشو جو مہینے میں بمشکل دس ہزار روپے ہی کماپاتا تھا وہ کس طرح پانچ ہزار روپے رشوت کی مد میں دیتا؟ ٹھیلا ضبط ہوتے ہی بابا بخشو کے گھر کا چولہا بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ آج بابا بخشو سڑک کنارے کھڑا ہر آنے جانے والے کے آگے ہاتھ پھیلائے بھیک مانگ رہا ہے۔ یہ شاید اس ملک کا سب سے امیر ترین شخص تھا جسے حکومت نے اچھی طرح کھنگالا تھا۔ آج بابا بخشو کے گھر کے حالات صرف اللہ بخش ہی جانتا ہے۔ ایف بی آر کو لازمی اس کے گھر کی بھی تلاشی لینی چاہیے۔ شاید اب بھی کچھ بچ گیا ہو۔ بابا بخشو امیر ترین لوگوں کی فہرست پانچویں نمبر پر آتے ہیں۔

نمبر (چار)

ہمارے محلے میں ایک فیملی رہا کرتی تھی جس کا گزر بسر صرف اور صرف پانچ روپے والے کیک کی فروخت پر تھا۔تھا اس لیے کہا کہ اب وہ فیملی یہاں سے کوچ کر گئی ہے،اس فیملی میں شوہر جس کا نام اصغر تھا وہ گھر سے بچوں کے لیے چھوٹے چھوٹے کیک بنا کر گلی محلوں میں چھابڑی میں رکھ کر فروخت کرتا تھا۔پھر ایک دن تبدیلی سرکار نے اس کا یہ روزگار بھی چھین لیا،اس کی روزانہ کی آمدن ڈھائی سو روپے ہوا کرتی تھی جب کہ رات میں وہ سیکورٹی گارڈ کی ڈیوٹی بھی دیا کرتا تھا جہاں سے اسے ماہانہ 15 ہزار روپے ملا کرتے تھے۔تین بچوں کا باپ انتھک محنت کے باوجود بھی گھر کا خرچ پورا نہیں کر پا رہا تھا،مالک مکان نے ڈالر مہنگا ہونے کا رونا رو کر اس پر یہ بم گرایا کہ آج سے کرایہ میں 2 ہزار روپے اضافہ کر رہا ہوں،اگر رہنا ہے تو کرایہ 8 ہزار روپے دینا ہوگا ورنہ تمہاری مرضی۔ایک کمرے کے مکان کا کرایہ آٹھ ہزار روپے،گیس اور بجلی کا بل ملا کر 10 ہزار روپے ماہانہ نکالنا اصغر کے لیے نہایت مشکل ترین کام بن گیا تھا۔اس نے ہمت نہیں ہاری اور کام کرتا رہا۔پھر مہنگائی کے مارے اصغر کے گھر جہاں دو وقت کی روٹی بنا کرتی تھی وہاں اب ایک وقت کی روٹی بھی مشکل ہوتی جا رہی تھی۔قرض سر پر چڑھتا گیا اور بالآخر وہ یہاں سے کہیں دور چلا گیا۔آخری ملاقات ہوئی تو اس نے نم آنکھوں سے اتنا کہا کہ میں چوری ڈاکا نہیں مار سکتا۔بیوی بچوں کو لے کر کہیں بھی چلا جاؤں گا اب یہاں گزارہ بہت مشکل ہو رہا ہے۔بچے بھوک سے بلکتے نہیں دیکھ سکتا۔پڑوسی کے بچے دس بیس روپے خرچ کرتے ہیں اور میں اپنے بچوں کو یہ بھی نہیں دے سکتا۔اس لیے یہاں سے جا رہا ہوں۔معلوم نہیں زندگی کہاں لے جائے۔لیکن اب میرے ہاتھ کچھ نہیں۔ایف بی آر کو فوری طور پر اس کا ٹھکانہ معلوم کرنا ہوگا اس شخص کے پاس اب بھی حکومت کے خزانے میں جمع کرانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور ہوگا۔فہرست میں اصغر کا نمبر چوتھا ہے۔

نمبر (تین)

رحیم بلوچ۔لیاری کا رہائشی تھا۔اللہ اس کی مغفرت فرمائے۔حکومت کی جانب سے عوام کو دی جانے والی ریلیف برداشت نہ کر سکا اور خوشی کے مارے خودکشی ہی کر لی۔جاتے جاتے اپنے بیوی بچوں کو اس خوشی میں اکیلا چھوڑ گیا تا کہ وہ اس ریلیف سے خوب عیاشیاں کر سکیں۔کے الیکٹرک نے بل بھیجا 10 ہزار روپے کا،کافی دفتروں کے چکر لگائے مگر کہیں کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔تین مہینے تک بل کے چکر میں لگا رہا اور اس دوران کے الیکٹرک نے ادھر ادھر سے سارے ٹیکس جمع کر کے ایک ساتھ ہی تین ماہ کا بل بھیج دیا۔جسے دیکھ کر رحیم کے ہوش اڑ گئے۔کام کاج پہلے ہی نہیں تھا اوپر سے اتنا بل اس کے لیے خودکشی کا باعث ہی بننا تھا۔گھر میں فاقے،مالک مکان کو دو مہینے سے کرایہ ادا نہیں کر پایا۔بیچارے نے آسان حل نکالا کہ پھانسی لگا کر اس زندگی کا خاتمہ ہی کر دوں۔نہ رہے بانس نہ بجے گی بانسری۔ مگر اسے کیا معلوم کہ اس کے بعد اس گھر پر کتنے لوگوں کی بری نظریں لگ جائیں گی اور کس طرح اس کے گھر والوں کا گزر بسر ہوگا۔خود تو چلا گیا مگر پیچھے لمبی داستان چھوڑ گیا۔حکومت کو پہلی فرصت میں اس کے گھر سے بچا کچا سامان اٹھا لینا چاہیے تا کہ اس گھر کے باقی ممبران بھی اگر خودکشی کر لیں تو کم از کم کوئی رشتے دار اس پر قبضہ نہ کر لے۔فہرست میں

رحیم تیسرے نمبر پر ہے۔

نمبر (دو)

(س) کو اسکول کی طرف سے ایک لیٹر موصول ہوا جس میں لکھا تھا کہ اسکول نے آپ کے بچوں کی فیس جو گزشتہ تین سالوں سے نہیں بڑھائی اب پندرہ سو روپے اضافے کے ساتھ فی بچے کی فیس 3500 روپے کر دی ہے، تین بچوں کی ٹوٹل فیس 10 ہزار پانچ سو روپے آپ نے جمع کرانی ہے۔ یہ لیٹر کسی ایٹم بم سے کم نہ تھا۔ بچاری نے برقعہ پہنا اور اسکول چلی گئی۔ ٹیچر سے ملاقات بے کار ثابت ہوئی، پرنسپل نے یہ کہہ کر ملاقات کرنے سے انکار کر دیا کہ ہم اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتے، ایڈمنسٹریٹر سے معاملات طے کرلیں۔ تین دن بعد ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات ہوئی تو صرف اتنا ہوا کہ پانچ سو روپے کم کر دیے گئے، مطلب راؤنڈ فگر میں 10 ہزار روپے ماہانہ فیس جمع کرانا لازمی قرار دے دیا گیا۔ مجبوراً بچوں کو اسکول سے نکلوا دیا۔ لیکن سرٹیفکیٹ کے لیے تین سالوں سے جو رعایت مل رہی تھی وہ واپس لے لی گئی اور تمام فیس مکمل جمع کرانے کے بعد سرٹیفکیٹ دینے کی شرط عائد کر دی۔ مجبوراً ہو کر دوبارہ بچوں کو اسکول بھیجنا شروع کر دیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے بچوں کو اسکول سے نکلوا دیا تھا اس لیے نئے سرے سے تمام معاملات ہوں گے۔ جس کا مطلب تھا تمام رعایت ختم، ایڈوانس فیس اور جون جولائی کی فیس یکمشت ادا کرنی ہوگی۔ گھر میں کھانے کیلیے جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ بھلا کس طرح اتنی بھاری بھرکم فیسیں ادا کرتیں۔ آج اس کے بچے گھر میں بیٹھے ہیں۔ تمام تر جھنجھٹ سے آزاد، نہ اسکول کی فیس کا ڈر، نہ روز روز کے طعنے سننے کو ملیں گے۔ گھر میں جو دال چٹنی ہوگی اس پر ہی شکر ادا کرتے رہیں گے۔ شوہر تو پہلے ہی دنیائے فانی سے رخصت ہو چکے ہیں اب ان پڑھ (س) اکیلی کب تک اس دنیا کا مقابلہ کرے۔ جس نے بھی مدد کی اور جس نے بھی کوئی راستہ دکھایا صرف اپنے مطلب کیلیے دکھایا۔ امید رکھیں بہت جلد اس گھر سے بھی خودکشیاں ہوں گی اور وہ سب ایک ساتھ، کیوں کہ ماں کبھی اکیلے اپنے بچوں کو نہیں چھوڑتی۔
حکومت کو خوش ہونا چاہیے کہ آبادی تیزی سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ بجٹ بنانے میں آسانی پیدا ہوگی۔ ایف بی آر ابھی سے نوٹ کر لے بعد میں کہیں سرکار کا نقصان نہ ہو جائے۔ فہرست میں (س) کا نمبر دوسرا ہے۔

نمبر (ایک)

یہ کہانی بھی ایک دوسرے سے کافی ملتی جلتی ہے مگر اس میں ایک بے بس باپ نے بڑی مشکل سے ایک دکان کرایہ پر حاصل کی اور اپنے روزگار کا آغاز کیا۔ آمدن اتنی تھی کہ بمشکل ہی گھر کا گزر بسر ہو رہا تھا پھر اچانک ایک لیٹر موصول ہوا کہ آپ کی دکان غیر قانونی ہے اور چوبیس گھنٹے میں اسے خالی کر دیا جائے ور بصورت نقصان کی ذمے داری خود آپ پر عائد ہوگی۔ کافی بھاگ دوڑ کے بعد دکان کا سامان گھر میں شفٹ کر دیا اور اگلے دن دکان کو ڈھا دیا گیا۔ مالک مکان سے جب اس سلسلے میں ایڈوانس کا تقاضا کیا کہ بھائی آپ کو ایک لاکھ روپے دکان کا ایڈوانس دیا تھا اور ابھی مجھے صرف تین مہینے ہی ہوئے تھے دکان لیے ہوئے تو مالک مکان نے یہ کہہ کر ایڈوانس دینے سے انکار کر دیا کہ میرا ابھی نقصان

ہوا ہے، اب دکان نہیں رہی تو ایڈوانس کس بات کا۔ یہ نقصان اس بے بس باپ کے لیے بہت بڑا تھا جسے وہ برداشت نہ کر سکا اور سیدھا کارڈیو پہنچ گیا۔ جہاں بائی پاس کے بعد اب وہ اس کنڈیشن میں نہیں کہ کوئی بھاری کام کر سکے۔
اسپتال والوں نے الگ تنگ کرنا شروع کر دیا تھا کہ پیسے دو، ورنہ علاج بند کر دیا جائے گا۔ گھر میں رکھا سامان فروخت کر کے فیس ادا کی گئی اور اس طرح اس امیر ترین شخص کی جان چھوٹی۔ آج یہ باپ اپنے بچوں کے ساتھ ایک کمرے کے مکان میں رہ رہا ہے، بیوی پولیوورکر بن گئی، بیٹی نے ٹیوشن شروع کر دیا۔ باپ نے گھر کے باہر بچوں کی ٹافیاں فروخت کرنا شروع کر دی ہیں۔ شاید گھر کے حالات بدل جائیں۔ مگر بائی پاس کے بعد جینے کے لیے درکار ادویات کی بڑھتی قیمتیں اس کے لیے ایک اور بائی پاس کا بندوبست کر رہی ہیں شاید یہ آخری بائی پاس ہو اس کا۔ تین بیٹیاں ہیں جنہیں بیاہنا ابھی باقی ہے، بیٹا بہت چھوٹا ہے اس لیے سہارا نہیں بن سکتا، اور حکومت اتنی اچھی نہیں کہ اس کے گھر کا خرچ اٹھا سکے۔ جس طرح تیزی سے مہنگائی ہو رہی ہے اس سے تو لگتا ہے ماں بھی تھک ہار کر بہت جلد کارڈیو پہنچے گی۔ بیٹیاں اس وقت ہمت کی مثال بنی ہوئی ہیں مگر ٹیکسز کے آگے کب تک ان کی ہمت چلتی ہے یہ دیکھنا باقی ہے۔
حکومت کو یہاں بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ بہت کچھ مل سکتا ہے خزانے میں جمع کرنے کے لیے۔ ایف بی آر نوٹ فرما لے۔ یہ بے بس گھرانہ امیر ترین لوگوں کی فہرست میں پہلے نمبر ہے۔
آئے روز کے نت نئے ٹیکسز یہ کہہ کر لگائے جا رہے ہیں کہ ان سے عوام پر بوجھ نہیں آئے گا، مگر در حقیقت کہانی یہ ہے کہ جس چیز پر ٹیکس لگایا جاتا ہے اس کا سیدھا اثر غریب عوام پر پڑتا ہے، کارخانہ ہو یا فیکٹری دکان ہو یا ہوائی روزی ہر طرف آگ لگی ہوئی ہے، بہت چھوٹی سی مثال ہے کہ اگر اگر فلورملز پر ٹیکس لگتا ہے تو آٹے کی قیمت بڑھے گی، کاسٹ بڑھنے سے روٹی کی قیمتیں بھی معمول سے ہٹ جائیں گی، ڈبل روٹی، سلائس، کیک سمیت ہر اس چیز کی قیمتیں بڑھیں گی جس کا سیدھا تعلق آٹے سے ہو گا۔ یہ بات حکمرانوں کو کبھی سمجھ نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ فلورملز پر ٹیکس لگایا ہے عوام پر نہیں، مگر وہ یہ نہیں دیکھ رہے کہ وہ ٹیکس کی رقم عوام سے نکال لیتے ہیں۔ اگر ملک میں چیک اینڈ بیلنس کا نظام بہتر کام کر رہا ہو تو پھر ٹیکس لگانے کا اثر عوام پر نہیں پڑے گا، تاہم یہاں ایسا کچھ نہیں۔ جس چیز پر ٹیکس لگا ان سب نے قیمتیں دگنی کر دیں۔ جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ ٹیکس کی آڑ میں اشرافیہ نے دونوں ہاتھوں سے لڈو کھانے شروع کر دیے ہیں۔ دس روپے کا ٹیکس بھی عوام سے وصول کر کے اپنے منافع کو آنچ تک نہیں آنے دیتے۔ ملک میں بڑھتی مصنوعی مہنگائی کو کنٹرول کرنا حکومت وقت کی اولین ذمے داری ہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ وقت دور نہیں جب بھوک کے ستائے لوگ سڑکوں پر نکل کر آئیں گے جو خونی انقلاب کا راستہ اختیار کر لے گا۔

بلدیہ ٹاؤن یا کچرا گھر

بلدیہ ٹاؤن کراچی کے پسماندہ علاقوں میں شمار ہونے والا ایک علاقہ ہے،اس کی قسمت کا دیا صرف ایک ہی مرتبہ جلا اور پھر سیاسی آب وہوا کے تبدیل ہوتے ہی تیز ہوا کے جھونکے نے اس امید کے دیے کو بھی بجھا دیا۔ کہتے ہیں بلدیہ کے علاقے مہاجر کیمپ کا شمار قیام پاکستان کے بعد جب مہاجرین کی آمد کا سلسلہ کراچی میں تیز ہوا تب کراچی میں کئی مہاجر کیمپ بنائے گئے جس میں ایک مہاجر کیمپ بلدیہ ٹاؤن میں موجود ہے جہاں آج بھی لاکھوں افراد بستے ہیں ۔اس لیے ہی اسے مہاجر کیمپ کا نام دیا گیا ہے۔

مہاجر کیمپ نمبر ایک سے سات نمبر تک کئی علاقے اس میں آتے ہیں۔مشرف دور حکومت میں جب بلدیاتی الیکشن کا خاکہ تبدیل ہوا تب اس علاقے کے حالات بھی تبدیل ہوئے۔نوجوان قیادت نے بلدیہ ٹاؤن کے حالات کو بہتر سے بہتر کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ناظم بلدیہ ٹاؤن کامران اختر نے دن رات انتھک محنت سے بلدیہ ٹاؤن کے کونے کونے میں ترقیاتی کاموں کا جال بچھا کر واضح کر دیا کہ بلدیہ ٹاؤن کراچی کا اٹوٹ انگ ہے۔

سابق ناظم بلدیہ ٹاؤن کامران اختر نے اپنی پوری ٹیم کے ساتھ مہاجر کیمپ ایک نمبر سے سات نمبر تک، 19D سے خیبر چوک، اتحاد ٹاؤن،تنویر کالونی سے داؤد گوٹھ تک سڑکوں کا جال بچھا کر بلدیہ ٹاؤن کی سوئی ہوئی قسمت کو
جگا دیا تھا۔کامران اختر کے دور میں 8 نمبر ہو یا 9 نمبر ہر علاقے کی کچی گلیوں میں سیوریج کے بہترین نظام کی تنصیب کے ساتھ ساتھ گلیوں کی پختگی کا کام بھی سرانجام دیا گیا،یہ کام انہوں نے کوئی دس سے بیس سالوں میں انجام نہیں دیے بلکہ محض اپنے پانچ سالہ دور اقتدار میں ہی ان تمام کاموں کو سرانجام دے کر بلدیہ ٹاؤن کا نام پسماندہ علاقوں کی فہرست سے نکال کر ماڈرن ٹاؤن کی فہرست میں لے آئے تھے۔انہی کے دور میں بلدیہ ٹاؤن میں پانی کا مسئلہ بھی حل ہوا اور کے تھری پروجیکٹ کے ذریعے بلدیہ ٹاؤن کے لیے الگ سے پانی کی لائن کی تنصیب کروا کر بلدیہ ٹاؤن کے پیاسے عوام کو سیراب بھی کیا۔گلی محلوں میں اسٹریٹ لائٹس کی تنصیب کے ساتھ نوجوانوں کے لیے کھیلوں کے گراؤنڈز کی تعمیر وترقی میں بھی کامران اختر نے خاصی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔

2010ء کے بعد بلدیہ ٹاؤن کی قسمت کا دیا اچانک بجھ گیا اور دیے میں موجود تیل بھی سیاسی بنیادوں پر نکال دیا گیا۔ کشادہ سڑکیں آہستہ آہستہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونا شروع ہوئیں اور آج بلدیہ ٹاؤن کی سڑکیں موئن جو دڑو کا منظر پیش کر رہی ہیں،اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ پورا بلدیہ ٹاؤن آج موئن جو دڑو کا منظر پیش کر رہا ہے۔گلی گلی میں

سیوریج کا پانی ہر آنے جانے والوں کو اپنی بے بسی کی داستان سنا رہا ہے، بلدیہ ٹاؤن میں بچھائی گئی پانی کی لائنیں خشک ہو کر زنگ آلود ہو چکی ہیں اور یہاں کے باسی آج مہنگے داموں پانی خرید کر پینے پر مجبور ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے جن کے ہاتھوں میں کتابیں اور کھیلنے کے لیے کھلونے ہونے چاہیے آج یہاں کے بچوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی پانی کی خالی بوتلیں ہیں جو ہر وقت پانی کی تلاش میں سرگرداں کبھی اس دروازے پر تو کبھی اس دروازے پر ایک بوتل پانی کے لیے بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔ ٹینکر مافیا نے اس تمام تر صورت حال کا بھرپور فائدہ اٹھایا اور فی ٹینکر 1200 روپے سے بڑھا کر 2000 روپے تک مکس پانی فروخت کرنا شروع کر دیا بعض علاقوں میں مکس پانی 3000 روپے تک کا فروخت کیا جا رہا ہے۔ نیول کالونی ہو یا نو نمبر تمام علاقے آج پانی کی بدترین قلت کا شکار ہو کر صومالیہ کا روپ دھار چکے ہیں۔

بلدیہ ٹاؤن کی قسمت کا دیا بجھتے ہی تمام سرکاری اور پرائیوٹ اداروں نے اپنے اپنے رنگ دکھانا شروع کر دیے، کے الیکٹرک نے لوڈشیڈنگ اور اوور بلنگ کے ذریعے بلدیہ ٹاؤن سے اربوں روپے کمائے تو واٹر بورڈ افسران نے پانی کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اپنے بینک بیلنس میں اضافہ کر کے بلدیہ ٹاؤن کی خوش حالی کو بدحالی میں تبدیل کیا۔ صفائی ستھرائی کا نظام سنبھالنے والا سرکاری ادارہ سولڈ ویسٹ مینجمنٹ نے بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھونا شروع کیا اور پورے بلدیہ ٹاؤن کو کچرے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا اور پرائیوٹ ٹھیکے داروں نے اس صورت حال سے بھرپور فائدہ اٹھا کر خوب پیسے بنائے۔ آج بلدیہ ٹاؤن کی ہر گلی اور ہر کوچہ اپنی بے بسی کی داستان سنا رہا ہے۔

1933 والا بلدیاتی نظام 2019ء میں بھی رائج ہے۔ دنیا چاند سے آگے نکل چکی ہے اور ہم آج بھی پرانے اور گھسے پٹے نظام کے سہارے زندگی بہتر بنانے میں مشغول ہیں۔ موجودہ بلدیاتی نظام میں جہاں بہت سے سارے نقائص ہیں وہیں عوام کو اب تک اس نظام کے بارے میں مکمل آگاہی تک نہیں مل سکی ہے۔ اگر کسی علاقے میں کسی شخص سے پوچھا جائے کہ یہاں کا چیئرمین کون ہے تو اسے معلوم نہیں، کونسلر کون ہے معلوم نہیں، یوسی کون سی ہے معلوم نہیں۔ جب لوگوں کو اپنے منتخب نمائندوں کے بارے میں معلومات نہیں ہوگی تو وہ کیسے اپنے مسائل کا حل تلاش کریں گے۔ منتخب نمائندے ہر وقت فنڈز کا رونا روتے دکھائی دیتے ہیں۔ کسی گلی میں سیوریج کا پانی جمع ہو گیا ہے تو اس کے لیے بھی چیئرمین کے پاس فنڈز نہیں کہ وہاں سے گندہ پانی ہی نکال لیں۔ کچرا اٹھانے کا کہا جاتا ہے تو بھی منتخب نمائندے یہ کہہ کر اپنے سر سے بلا ٹال دیتے ہیں کہ فنڈز نہیں ہیں۔

شہری علاقوں کی ترقی کے بغیر شہر قائد کی ترقی کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اب تک کسی میئر اور کسی وزیر اعلیٰ کو سمجھ نہیں آئی۔ وزیر اعظم عمران خان صاحب کہتے ہیں کہ نچلے طبقے کے مسائل حل ہوں گے تو ہی ہم ترقی کر سکتے ہیں اور یہ وہ نعرہ تھا تبدیلی کا جس کی بنیاد پر پاکستان تحریک انصاف حکومت میں آئی۔ تاہم اقتدار میں آتے ہی پاکستان تحریک انصاف کے منتخب عوامی نمائندوں کے جہاں قول و فعل میں تضاد آیا وہیں ان کے نعروں میں بھی تبدیلی آئی۔ اب انہیں

صرف وہ مسائل نظر آتے ہیں جو انہیں یا حکومت کو درپیش ہیں، جب کہ پسے ہوئے طبقے کی بات اب انہیں ناگوار گزرتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ بلدیہ ٹاؤن کے عوام آج پھر اسی نظام کو یاد کرتے ہیں اور اسی ناظم کو یاد کرتے ہیں جس نے بلدیہ ٹاؤن کا درد محسوس کرتے ہوئے اسے پسماندگی سے نکال کر خوش حالی کی طرف گامزن کیا تھا۔ کیوں کہ آج بلدیہ ٹاؤن وہیں کھڑا ہے جہاں سے ترقی کی شروعات کی تھی۔

پی ایس ایل اور اداروں کی منافقت

پی ایس ایل کا جوش جس طرح اپنے عروج پر ہے اسی طرح مختلف صوبائی اور بلدیاتی ادارے بھی چوبیس گھنٹے کام، کام اور صرف کام میں جتے ہوئے ہیں، ہر لحاظ سے اس میگا ایونٹ کو کامیاب بنانے کے لیے کئی جتن کیے گئے ہیں۔ سیکورٹی صورت حال کے باعث لاہور کے میچز بھی کراچی میں منعقد کرنے کے اعلان کے بعد سے شہر قائد کی انتظامیہ میں نیا جوش وولولہ سا نظر آ رہا ہے، چوبیس گھنٹے کام کرنے کے باوجود بھی چہرے پر تھکن نہیں، صرف ایک ہی جنون سر پر سوار ہے کہ کسی بھی طرح اس ایونٹ کو کامیاب بنانا ہے۔

میگا ایونٹ کی میزبانی ملنے پر شہری بھی خوش دکھائی دے رہے ہیں، سڑکوں، چوراہوں، فٹ پاتھوں اور دیگر تفریحی مقامات کو انتہائی خوبصورتی سے سجا کر انتظامیہ نے واقعی مثال قائم کی ہے جس پر ان کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

لیکن ٹھہریے۔۔۔ یہ وہی سندھ حکومت ہے اور یہ وہی لوکل انتظامیہ ہے جس کے پاس کسی بھی کام کے لیے کوئی فنڈ ہی نہیں تھا تو پھر اچانک سے کس طرح پیسہ آنا شروع ہو گیا اور کس طرح چند دنوں میں ہی شہر کی بدترین حالت کو بہترین بنا دیا گیا؟

سڑکوں کی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ دھلائی بھی کی جا رہی ہے، جو گاڑی یہ کام سرانجام دے رہی ہے اس کے پاس تو کبھی ڈیزل کے پیسے بھی نہیں تھے پھر اچانک یہ سب کس طرح ہو گیا کہ پیسہ بھی مل گیا اور کام بھی چل پڑا۔ کراچی دنیا کے بڑے شہروں میں سے ایک ہے جسے گلوبل سٹی کا خطاب بھی مل چکا ہے، یہ ہی وہ واحد شہر ہے جو پاکستان کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، جو مظلوم بھی ہے مگر سیاسی مفادات کی خاطر اسے ظالم بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تمام صوبوں کے لوگوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں اور ایک ماں کی طرح ان کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ مگر گندگی کے ڈھیر پر سیاست کرنے والے آج اسی گندگی کو دفنا کر شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے میں مصروف دکھائی دے رہے ہیں۔ کل تک کسی بھی بلدیاتی اور صوبائی ادارے کے پاس نہ تو اختیارات تھے اور نہ ہی کسی کے پاس فنڈز تھے کہ وہ شہر کی تعمیر وترقی پر بھی توجہ دیتے۔ نیوز چینلز پر ایک ہی خبر بار بار دیکھنے کو ملتی تھی جس میں سیاستدان اپنے اپنے مفادات کو

ترجیح دیتے نظر آتے تھے۔مگر اچانک پی ایس ایل کی کراچی آمد کا اعلان ہوتا ہے اور پھر سب کچھ بدل جاتا ہے۔ سڑکوں سے کچرا غائب، دیواروں پر سفیدی، فٹ پاتھوں پر برقی قمقمے اور ہر طرف خوش گوار ماحول بنا کر کراچی کو دلہن کی طرح سجا دیا گیا۔

یہ سجاوٹ عارضی ہے مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس عارضی سجاوٹ پر اداروں نے کروڑوں روپے خرچ کر دیے۔یہ عوام کا پیسہ تھا اس کا حساب کس کے کھاتے میں جائے گا یہ بات کسی کو معلوم نہیں اور نہ ہی کوئی اس پر ایکشن لے گا، کیوں کہ یہ عارضی سجاوٹ کو ملکی خوش حالی کا نام دیا گیا ہے۔کل تک وزیر بلدیات کو فرصت ہی نہیں تھی کہ وہ شہر کے حالات پر بھی کوئی دو لفظ کہہ دیتے۔مگر آج وہ ہر وقت شہر کی رونق کی بات کرتے نہیں تھکتے۔کل تک میئر کراچی کے پاس شہر کی صفائی ستھرائی کے لیے فنڈ نہیں تھا اب وہ دن رات کام میں مصروف دکھائی دے رہے ہیں۔عوام یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ جس طرح کراچی میں وردی والوں نے امن قائم کیا کہیں اس صفائی ستھرائی کے پیچھے بھی تو وردی کا ہاتھ تو نہیں؟ اور اگر جمہوری بچوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ خالصتاً حکومتی اداروں کی محنت ہے تو پھر پی ایس ایل سے قبل یہ فنڈز کہاں غائب تھے جو آج اچانک تجوریوں سے باہر آ گئے؟

پی آئی ڈی سی سے لے کر نیشنل اسٹیڈیم تک ہر جانب پولیس کمانڈوز، رینجرز اور فوج کے دستے تعینات ہیں، بڑی عمارتوں پر اسنائپر موجود ہیں، تمام علاقوں کو جدید کیمروں کی مدد سے مانیٹر کیا جا رہا ہے، جہاں کوئی پرندہ بھی ان کی نظروں سے بچ کر نہیں جا سکتا۔بے شک غیر ملکی مہمانوں کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے، مگر کیا عوام کے جان و مال کے لیے کبھی اس طرح کے اقدامات کیے گئے؟ کیا کبھی عوام کے لیے اداروں نے اتنی محنت کی؟ کیا کبھی صوبائی اور وفاقی حکومتوں میں اس طرح کا اتحاد نظر آیا جو آج پی ایس ایل کی خاطر نظر آ رہا ہے؟ جتنا پیسہ آج محض عارضی سفیدی اور چمک دمک پر کیا گیا ہے اگر یہی فنڈ زدرست سمت میں استعمال کر کے کیا جاتا تو شاید یہ ایک عرصے تک برقرار رہتا اور عوام بھی اپنی تکلیفوں کو کچھ عرصے کے لیے بھول جاتے۔چند دن پہلے تک ان ہی سڑکوں پر ہر وقت بدترین ٹریفک کی صورت حال نظر آتی تھی، مگر آج انہیں سڑکوں پر ٹریفک رواں دواں رہتا ہے۔اس کی وجہ ٹریفک پولیس کا ایمانداری سے ڈیوٹی دینا ہے جو اس سے قبل کبھی نہیں دی گئی۔ٹریفک پولیس جو ہر وقت چالان اور جیب خرچ کے پیچھے بھاگتی نظر آتی تھی آج وہی ٹریفک پولیس ہے جسے نہ تو چالان کی فکر ہے اور نہ ہی اپنی جیب کی، بس ایک ہی چیز پر نظر ہے کہ ٹریفک رواں دواں رہے۔اگر یہی ٹریفک پولیس ایمانداری سے اپنا کام ہر وقت کرتی رہے تو شہر میں ٹریفک جام کا مسئلہ ہی پیدا نہ ہو۔شہر میں کوئی ایسا شخص نہیں جو نہ جانتا ہوں کہ ٹریفک پولیس ہمیشہ ٹریفک کے دوران غائب رہتی ہے ، یا پھر کسی کونے میں کھڑی شکار کا انتظار کرتی نظر آتی تھی۔

اسی طرح پولیس کمانڈوز جو ہر وقت پروٹوکول اور قافلوں میں دکھائی دیتے تھے آج وہ ہی کمانڈوز سڑکوں کی خاک چھان رہے ہیں اور ہر آنے جانے والی گاڑیوں اور لوگوں کا بغور جائزہ لے رہے ہیں۔یہ کمانڈو اچانک کہاں سے آ گئے؟ کیا

اب وہ آئی پی ڈیوٹیاں ختم ہو گئیں ہیں جو انہیں فارغ کر کے سڑکوں پر نکال دیا گیا ہے؟ محکمہ باغات کے پاس فنڈز نہیں تھے اس لیے شہر کے پودے اور درخت سوکھ کر ختم ہونے کے قریب آ چکے تھے مگر اچانک وہ محکمہ باغات ہر دو، تین گھنٹے بعد پودوں اور درختوں کو پانی دیتا نظر آ رہا ہے۔کتابوں میں پڑھا تھا کہ کراچی کی سڑکوں کی دھلائی بھی ہوتی تھی مگر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہے ہیں، اس سے پہلے یہ ادارے کہاں تھے جو آج اچانک خلائی مخلوق کی طرح برآمد ہو کر عوام کو حیران و پریشان کر رہے ہیں؟

پی آئی ڈی سی برج پر دس پندرہ برس سے اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں ہوئیں، آج کے الیکٹرک نے انہیں بھی روشن کر کے عوام کو حیران کر دیا ہے، کئی مرتبہ مختلف اداروں اور شخصیات کی درخواست کے باوجود اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں کی گئیں مگر آج پی ایس ایل کی خوشی میں بہنے والی گنگا میں کے الیکٹرک بھی ہاتھ دھونے کے بجائے نہاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔شاہراہ فیصل پر لگی اسٹریٹ لائٹس بھی آج روشن ہو کر کے الیکٹرک کی کارکردگی پر سوالیہ نشان بنی ہوئی ہے۔اطراف کے علاقوں میں لوڈ شیڈنگ بھی کم کر دی گئی ہے جو اس قبل کے الیکٹرک کے بس کی بات نہیں تھی۔محکمہ سالڈ اینڈ ویسٹ مینجمنٹ بھی ہر وقت گلی محلوں اور سڑکوں پر گشت کرتا دکھائی دیتا ہے تاکہ جہاں کوئی گندگی ہو تو اسے فوری طور پر ہٹا دیا جائے۔جناح فیملی پارک جو ایک عرصہ بند رہنے کے بعد چند روز قبل ہی عوام کے لیے کھولا گیا تھا وہی جناح پارک آج پھر عوام کے لیے محض سیکورٹی خدشات کا سہارا لیتے ہوئے پھر بند کر دیا گیا ہے۔سپریم کورٹ کے احکامات کی دھجیاں اڑانے والا محکمہ ایڈورٹائز بھی غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر جی جان سے کام میں مصروف ہے۔جس کا ثبوت مختلف شاہراؤں پر ہٹائے گئے اشتہاری بورڈ ہیں۔

پی ایس ایل کے باعث آج روزانہ کی بنیاد پر صوبائی اور مقامی حکومتی اداروں کے اجلاس باقاعدگی سے ہو رہے ہیں تاکہ عوام کو کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔مگر درحقیقت یہ اجلاس عوام کو پریشانی سے بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی نوکریاں بچانے کے لیے ہو رہے ہیں۔اگر یہ ادارے روزانہ کی بنیاد پر نہ سہی پندرہ دن بعد بھی صرف ایک دن عوام کے لیے اجلاس کریں اور عوام کو درپیش مسائل پر بات کریں تو شاید برسوں کے مسائل مہینوں میں ہی ختم ہو جائیں۔

پی ایس ایل کی خاطر جس طرح تمام ادارے اپنی اپنی منافقت سے باہر آئے ہیں اگر اسی طرح وہ عوامی خدمات کو بھی اپنا شعار بنا لیں تو شاید کراچی دنیا کا بہترین اور خوبصورت شہر بن سکتا ہے اور جس طرح بے دریغ فنڈز عارضی کاموں میں خرچ کیے جا رہے ہیں اگر یہ فنڈز درست استعمال کیے جائیں تو شاید کراچی کے شہریوں کو کبھی تکلیف کا سامنا نہ کرنا پڑے۔یہ اب اداروں کی ذمے داری ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں منافقت کا لبادہ اوڑھ کر اپنی آخرت کالی کرنا چاہتے ہیں یا اب واقعی حقیقی طور پر بھی عوامی بھلائی کے لیے بھی کچھ کرتے ہیں، فیصلہ ان کے ہاتھ میں ہے۔

پولیس کی تربیت ناگزیر

پولیس کا نظام کسی بھی معاشرے کا اہم حصہ رہا ہے، حضرت عمر ? کے دور میں پولیس کا نظام رائج ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پوری دنیا میں چھا گیا۔ پولیس معاشرے میں امن وامان کے نفاذ کے ساتھ ساتھ قوت کا جائز استعمال کرتے ہوئے عوامی وسماجی نظم ونسق کو برقرار رکھنے کی ذمے دار ومختار ہوتی ہے ۔فارسی میں اسے دربان، چوکیدار، نگہبان اور حفاظت کرنے والے کے طور پر جانا جاتا ہے ۔پولیس کا براہ راست تعلق عوام سے ہے اور اسے عوام کے بیچ رہ کر ہی اپنا کام سرانجام دینے کی تربیت فراہم کی جاتی ہے، جس طرح ایک بچے کی تربیت کی ذمے داری ماں پر عائد ہوتی ہے اسی طرح پولیس ملازمین کی تربیت کی ذمے داری بھی محکمے کے سربراہ پر عائد ہوتی ہے، پولیس اپنی طاقت اور اختیارات کی بدولت معاشرے میں امن وامان کی صورت حال برقرار رکھنے کے لیے اپنے جائز اختیارات کو استعمال کر کے اسے ممکن بناتی ہے ۔

پاکستان میں پولیس کا محکمہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی عمل میں آگیا تھا کیوں کہ اس کے بغیر کسی بھی معاشرے کا پروان چڑھنا ناممکن ہے، پولیس کے بغیر معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے اور قتل وغارت کے ساتھ ساتھ لوٹ مار اور چوری، ڈکیتی کی وارداتیں عام ہو جاتی ہیں، جس سے معاشرہ تاریکی میں ڈوب جاتا ہے ۔اس کی سیدھی سی مثال صومالیہ اور سوڈان جیسے ممالک کی ہے جہاں پولیس ہونے کے باوجود نہ ہونے کے برابر ہے ۔سوڈان اور صومالیہ جیسے حالات آج کل پاکستان کے سب سے بڑے اور دنیا کے ساتویں بڑے شہر کراچی کو درپیش ہیں ۔کراچی پولیس اس وقت کراچی میں امن وامان کی دعویدار تو ہے مگر اس کے پیچھے رینجرز اور انٹیلی جنس اداروں کا ہاتھ بھول گئی ہے، جس نے انتھک محنت اور خفیہ اطلاعات پر کئی آپریشن کے بعد کراچی کو امن کا گہوارہ بنایا ۔تاہم اب رینجرز شاید ان معاملات میں زیادہ دلچسپی نہیں لے رہی اور اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا ہے اور تب سے صورت حال واپس پرانی سطح پر جاتی نظر آرہی ہے ۔

کراچی پولیس آج معاشرے میں امن وامان کے بجائے عدم استحکام کا ذریعہ بنی ہوئی ہے ۔جہاں لوٹ مار کرنے والوں کو بھتے کے عوض کھلی چھوٹ دے دی گئی ہے ۔کراچی کے علاقے صدر ٹاؤن میں موجود پریڈی تھانہ کراچی کے اہم اور حساس تھانوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن یہاں اقربا ء پروری اور کھلی رشوت عام ہو چکی ہے، اہلکاروں میں نہ بولنے کی تمیز رہی اور نہ ہی روڈ پر کھڑے ہونے کا کوئی ڈھنگ نظر آتا ہے ۔یہاں ہونے والی تمام اچھائی برائی کے ذمے دار ایس ایچ او نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے ہیں ۔اگر کوئی عام شخص انہیں اپنی مدد کے لیے طلب کرے تو پہلے ہی

اسے یہ کہہ کر انکار کر دیا جاتا ہے کہ یہ کام پولیس کا نہیں ۔عید کی چھٹیوں میں جہاں ہزاروں شہری کراچی سے باہر کا سفر کرتے نظر آتے ہیں وہیں مسافر کوچز مالکان کی بھی چاندی ہوجاتی ہے۔اسی ایک معاملے کو پولیس تک پہنچانے کی ایک گستاخی ہم سے بھی ہوئی جب میں نے ایس ایچ او پریڈی کو فون کیا تو ایس ایچ او صاحب نے پہلے سلام کیا اور پھر جب میں نے انہیں مسئلہ بتایا کہ تاج کمپلیکس پر مختلف کوچز کے مالکان نے از خود اضافہ کر کے کرایہ 500 کے بجائے 1500 اور 1800 روپے وصول کیا جارہا ہے جو عوام کے ساتھ سراسر ظلم ہے ۔آپ اس سلسلے میں پریشان حال مسافر فیملیز کی مدد کریں ۔تاہم ہماری یہ بات ایس ایچ او کو اتنی ناگوار گزری کہ انہوں نے آگے سے جو مجھے جواب دیا وہ بھی آپ ملاحظہ فرمائیں ۔(اب یہ کام بھی ہمارا رہ گیا ہے، گٹکا بھی ہم کھلوائیں، کرائے بھی ہم کم کرائیں، پورے کراچی کا ٹھیکہ ہم نے لے کر رکھا ہے، اپنا کام کرو بھائی ۔)ابھی ان کی بات جاری تھی کہ میں نے صرف یہ کہہ فون بند کر دیا کہ (جناب بہت بہت شکریہ آپ کا، مجھ سے غلطی ہوگئی جو میں نے آپ کو فون کیا ۔معذرت چاہتا ہوں ۔)اس طرح کے الفاظ سننے کے بعد کیا عام شہری کے دل میں پولیس کے لیے عزت بڑھے گی؟ جس کا سیدھا اور آسان جواب یہی ہے کہ ہرگز نہیں بلکہ عام شہری کے دل میں پولیس کے لیے مزید نفرت پیدا ہوگی اور وہ یہی سوچنے پر مجبور ہو جائے گا کہ جب پولیس نے میری مدد کرنے سے انکار کر دیا تو اب میں بھلا کس سے اپنی فریاد کروں؟ ۔اس طرح وہ اضافی کرایہ دینے پر مجبور ہو جائے گا، جس سے ملک میں کرپشن کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

آپ جب بھی سڑک پر نکلتے ہوں گے تو کہیں نہ کہیں پولیس اہلکار کسی موٹر سائیکل سوار کو روک کا اپنے جیب خرچ کا بندوبست کرتا نظر آئے گا، کہیں پولیس اہلکار کے ہاتھ میں سگریٹ ہوگی تو کسی کا گریبان کھلا دکھائی دے گا ہر پر ٹوپی جسے وہ صرف اپنے افسرانِ بالا کے سامنے پہنتے دکھائی دیتے ہیں لیکن آج تک روڈ پر کھڑے اہلکاروں کے سر پر ٹوپی نظر نہیں آئی ۔اکثر پولیس اہلکاروں کو دوران ڈیوٹی پان گٹکا کھاتے ہوئے دیکھا گیا ہے، جب بھی ان سے بات کرنی پڑ جائے تو پہلے وہ آپ کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے آپ کوئی دہشت گرد یا پھر خلائی مخلوق ہوں ۔ان سے بات کرتے ہوئے شریف آدمی کو ہمیشہ ایک خوف محسوس ہوتا ہے کہ معلوم نہیں کب ان کا میٹر گھوم جائے اور یہ ہمیں ایک مشہور اور معروف دہشت گرد بنا کر اندر کر دیں ۔

گٹکے پر پابندی کے باوجود صدر جیسے مصروف ترین علاقے میں جابجا گٹکا فروخت ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے، سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ پریڈی تھانے کی دیوار کے ساتھ موجود پان کے کیبن پر گٹکا فروخت ہو رہا ہے ۔کیا اب ایس ایچ او صاحب کو بتانا پڑے گا کہ یہ کام آپ کا ہے ۔اگر کرائیوں میں کمی کا کام ان کا نہیں تو پھر گٹکا کھلوانے کا کام ان کا کہاں سے ہوگیا؟ زہریلی گٹکے کی فروخت پر افسران کی آنکھیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں کہ کہاں کہاں غیر قانونی کام ہو رہا ہے لیکن عوامی مسائل کے حل کیلئے کبھی ان سے مدد طلب کی جائے تو پھر وہ ان کا کام نہیں ہوتا ۔

اسی طرح بلدیہ ٹاؤن میں پولیس اہلکار جب موٹر سائیکل پر گشت کرتے دکھائی دیتے ہیں تو عوام انہیں محافظ کے بجائے

دہشت گرد، بھتہ خور جیسے الفاظ سے پکارا کرتی ہے اور ایسا ہونا کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کیوں کہ جن پولیس اہلکاروں کے گریبان کھلے ہوں، موٹر سائیکل کی نمبر پلیٹ غائب ہو، چھوٹا اسلحہ ہاتھ میں تھام کر ہوا میں لہراتے ہوئے چل رہے ہوں تو پھر کوئی بھی انہیں پولیس والا کم بدمعاش زیادہ کہے گا۔اس سلسلے میں ایس ایچ او اتحاد ٹاؤن کو ایک میسیج کے ذریعے یاددہانی بھی کرائی جا چکی ہے مگر وہاں بھی اب تک کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور نہ ہی ان پولیس اہلکاروں کے طور طریقے تبدیل ہوئے ۔یہ معاملات صرف ایک تھانے کی حدود میں نہیں بلکہ بلدیہ ٹاؤن سمیت کراچی کے ہر تھانے میں نظر آتے ہیں ۔تاہم بلدیہ ٹاؤن میں جا بجا گٹکا مافیا کا نظر آنا اب تعجب کی بات نہیں رہی، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جہاں چھوٹے چھوٹے بچوں کو کرسٹال چرس اور ہیروئن جیسی گندی عادتیں لگ چکی ہوں وہاں گٹکا بکنا عام سی بات تصور کی جاتی ہے، لیکن مجال ہے کہ اس معاملے میں پولیس جسے عوام کا نگہبان کہا جاتا ہے کے کان پر کوئی جوں تک رینگ جائے ۔

متعلقہ اداروں کے سربراہان نے اگر اب بھی پولیس کی اخلاق اور پیشہ ورانہ تربیت پر دھیان نہ دیا تو وہ وقت دور نہیں جب کراچی کے ہر گلی محلے میں چرس، جوا، سٹہ اور دیگر جرائم کے اڈے کھل جائیں گے اور شہر کا بچہ بچہ اس گندی صحبت میں پڑ کر ملک کے لیے ناسور بن جائے گا۔اگر ان میں ایک بچہ میرا ہو گا تو دوسرا بچہ یقیناً آپ کا ہو گا۔لہذا اب بھی وقت ہے اپنی پولیس پر دھیان دیں اور اپنے اس اہم محکمے میں موجود افسران و اہلکاروں کو نکال باہر کریں جو محکمے کی بدنامی کے ساتھ ساتھ ملک دشمنی میں بھی مصروف ہیں ۔

ہمارا حکمران چور ہے؟

گزشتہ روز کراچی کے مختلف علاقوں میں ٹھیلے اور پتھارے والوں کے خلاف بھرپور آپریشن کیا گیا ۔جہاں جہاں ٹھیلے اور پتھارے نظر آئے انہیں اٹھا کر لے جایا گیا اور 5 ہزار روپے رشوت کے عوض رہائی دی گئی ساتھ ہی ضبط مال بھی واپس نہیں کیا گیا ۔اس آپریشن کے بعد ان گلی محلوں کی مارکیٹیں تو کشادہ ہوگئیں مگر ساتھ ہی ان مارکیٹوں میں ویرانی بھی چھا گئی ۔متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے اور سفید پوشی کا بھرم رکھنے والے لوگ ان ہی ٹھیلے اور پتھاروں والوں سے اپنی ضروریات زندگی پوری کررہے تھے ،کیوں کہ انہیں دکان کا کرایہ ادا نہیں کرنا ہوتا (سوائے بھتے کے) اور سبزی و دیگر اشیائے خورد و نوش بھی سستے داموں مل جایا کرتی تھیں جس سے دونوں طبقات اپنی زندگی کی گاڑی کو کسی نہ کسی طرح گھسیٹ رہے تھے ۔

تبدیلی سرکار کا بجٹ جس طرح امیروں کو پسند نہیں آیا وہیں غریب کی تو جان ہی لے گیا ۔عوام بے روزگاری اور مہنگائی سے پہلے ہی مری جارہی تھی رہی سہی کسر اشیائے خورد و نوش پر ٹیکس کی بھرمار نے پوری کردی جس سے غریب آدمی زندہ لاش بن چکا ہے ۔تبدیلی کے دعوے اور فلاحی ریاست کے خواب دکھا کر ووٹ مانگنے والوں نے مملکت خداداد کو ظلم کی ریاست میں تبدیل کردیا ۔ 6 ماہ میں سب کچھ بہتری کے دعوے اپنی جگہ لیکن عوام کی حالت بد سے بدتر کرنے میں حکومت نے پوری ایمانداری سے کام لیا ۔وزیر اعظم صاحب ٹھنڈے کمرے میں بیٹھ کر قوم سے الٹا یہ مذاق بھی کرتے رہتے ہیں کہ بس تھوڑی سی مشکلات ہیں جس کا ہمیں صبر اور ہمت سے مقابلہ کرنا ہوگا ،لیکن وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ایک غریب جس کی تنخواہ 15 سے 20 ہزار روپے ماہانہ ہو وہ کس طرح اپنے اخراجات کنٹرول کرے ۔آٹا 46 روپے فی کلو فروخت ہورہا ہے ،صرف سوکھی روٹی بھی کھائے تو بھی وہ بیس ہزار روپے میں مہینہ نہیں نکال سکتا ۔جس تیزی سے ڈالر اوپر جارہا ہے اتنی ہی تیزی سے مکان کے کرائے بھی بڑھائے جارہے ہیں ،جنہیں روکنے اور پوچھنے والا ملک میں کوئی نہیں ۔صاحب حیثیت لوگوں نے اپنا سرمایہ اب کسی اور کام میں انویسٹ کرنے کے بجائے پراپرٹی کے کاموں میں لگا رہے ہیں ۔دو تین بلڈنگ بنا کر ان سے وہ ماہانہ لاکھوں روپے کرایہ وصول کررہے ہیں جس کا کوئی

حساب کتاب نہیں ہوتا۔وزیر اعظم کا سارا دھیان اس طرف ہے کہ ٹیکس کہاں کہاں سے لینا ہے مگر اس پر کسی کا دھیان نہیں جا رہا کہ ایک غریب سے ایک مالک مکان کتنا کرایہ وصول کر رہا ہے اور وہ کس طرح امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے؟

کچی آبادیوں میں کی جانے والی سرمایہ کاری سے سرمایہ کار ماہانہ اربوں روپے وصول کر رہے ہیں اور یہ سب پیسہ کیش میں وصول کیا جاتا ہے جو بعد ازاں تجوریوں کی نذر ہو رہا ہے ایسے میں کیسے اور کس طرح معلوم ہو گا کہ کس کے پاس کتنی دولت ہے۔ایک شخص نے ایک بلڈنگ اپنے نام کر رکھی ہے جس میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اس بلڈنگ میں اس کی فیملی رہائش پذیر ہے، رہائشی عمارت پر کوئی ٹیکس بھی نہیں۔ساتھ ہی اس شخص نے چار پانچ بلڈنگیں اپنے بچوں کے نام کر رکھی ہیں جس سے وہ ماہانہ کرایہ وصول کر رہا ہے، ایک عیاشی والی زندگی گزاری جا رہی ہے، لیکن ٹیکس کے نام پر کچھ بھی نہیں نکلتا۔تاہم غریب ہر قسم کی مصیبتوں سے دوچار ہونے کے باوجود ہر چیز پر ٹیکس دینے کا پابند ہے۔

ہمارے وزیر اعظم صاحب ہر تقریر میں یورپ کی مثالیں دینے کے عادی ہیں لیکن اس طرح کے قوانین کب بنائیں جائیں گے جو یورپ میں ہیں؟ کرایہ داری ایکٹ پر آج تک عمل نہیں ہو سکا تو باقی معاملات پر کیا امیدیں وابستہ رکھیں۔پڑھے لکھے بے روزگار نوجوانوں نے غربت سے تنگ آکر جب اپنی روزی روٹی ٹھیلے اور پتھارے کے ذریعے حاصل کرنا شروع کر دی، مگر یہ بھی ہمارے حکمران کو پسند نہیں آیا کہ وہ روزانہ 3 سے 5 سو روپے منافع کیوں کما رہا ہے، اس لیے اس سلسلے کو بھی جرم قرار دے کر بند کر دیا گیا۔سمجھ میں نہیں آرہا کہ ایک پتھارے والا کتنا کما لیتا ہو گا جس پر ٹیکس لگانے اور بلا وجہ گلی محلوں سے ہٹایا جا رہا ہے۔؟ 5 سو روپے روزانہ بھی اگر وہ کما رہا ہے تو یہ ماہانہ 15 ہزار بنتے ہیں، کیا وہ 15 ہزار روپے ماہانہ سے اپنا گھر چلا سکتا ہے؟ اگر چلا سکتا ہے تو برائے مہربانی ہمیں بھی وہ ترکیب بتا دیں تاکہ ہم بھی اس پر عمل کر کے اپنا گھر چلا سکیں۔

وزیر اعظم صاحب آپ فوج کی تعریف کرتے نہیں تھکتے کہ انہوں نے بجٹ میں اضافہ نہ لے کر جہاں حب الوطنی کا اظہار کیا وہیں قوم پر احسان بھی کیا۔مگر یہ بھی دیکھ لیں کہ بجٹ میں اضافہ نہ کرنے باوجود عوام کو کیا ملا؟۔وہ تو پہلے سے زیادہ مہنگائی اور بے روزگاری کے اژدھے سے ڈسی جا رہی ہے۔پھر آپ کو پریشانی بھی اگر دکھائی دیتی ہے تو وہ بھی صرف سرکاری ملازمین کی۔اگر ملازمین کا موازنہ ایک عام آدمی سے کیا جائے تو سرکاری ملازمین کے پاس پکی نوکری ہے وہ اگر دفتر نہ بھی جائے تو بھی اسے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو تنخواہ مل جاتی ہے۔پھر سالانہ 10 اور 20 فیصد اضافہ الگ دیا جاتا ہے، ہاؤس رینٹ اور فیول کی مد میں بھی الگ سے پیسے ملتے ہیں، ریٹائرمنٹ پر گریجویٹی اور بعد میں پنشن کا سلسلہ الگ سے لگا رہتا ہے۔لیکن ایک غریب محنت کش کو کیا ملتا ہے؟ وہ جب تک زندہ رہتا ہے اسے محنت

کر کے دو وقت کی روٹی کھانی پڑتی ہے لیکن سرکاری ملازمین کے ساتھ ایسا نہیں ۔سرکاری ملازم 60 سال کی عمر میں ریٹائر ہو کر ایک اچھی زندگی گزار رہا ہے ۔یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس ملک کی خدمت صرف سرکاری ملازمین کر رہے ہیں باقی عوام نہیں کر رہی ؟ آپ کے لوگ بجٹ بناتے وقت بھی اگر کسی کا خیال کرتے ہیں تو صرف اور صرف سرکاری ملازمین کا ہی کرتے ہیں کیوں کہ وہ خود سرکاری ملازمین جو ہیں، لیکن کسی فیکٹری میں دھاڑی پر کام کرنے والے کا بجٹ میں کبھی احساس نہیں کیا گیا ۔حکومت نے کبھی اس کے گھر کے چولہے کے بارے میں بجٹ میں کچھ سوچا، کیا کبھی کسی ٹھیلے والے یا ریڑھی والے کے بارے میں بجٹ میں کچھ رکھا گیا ؟ مدینے کی ریاست کا کہہ کر ظلم اور کفر کی ریاست میں عوام کو جھونکنے والی حکومت ان سوالوں کے جواب دینے سے قاصر ہے۔

وزیر اعظم صاحب جب آپ وزیر اعظم کی سیٹ پر نہیں بیٹھے تھے تب آپ کہا کرتے تھے کہ وی آئی پی پروٹوکول نے ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے، اشرافیہ ملک کو کھا گئی ہے، ہم ایسا نظام لائیں گے جس سے ہر طبقے کے لوگ مستفید ہوں گے ۔کیا آپ نے یہ نہیں کہا تھا کہ جب ڈالر اوپر جائے اور پیٹرول کی قیمتیں بڑھیں اور قرضے بڑھیں تو سمجھ لینا آپ کا حکمران چور ہے ۔تو کیا اب ہم یہ نہ سمجھیں کہ ہمارا حکمران بھی چور ہے ۔اس نے ہمارے ووٹ پر ڈاکا ڈالا، ہمیں سنہری خواب دکھا کر مہنگائی اور بے روزگاری کے دلدل میں مزید دھکیل دیا ۔؟ چلیں سب باتوں کو چھوڑ دیتے ہیں صرف یہ ہی بتا دیں کہ وہ پیسا کہاں گیا جو آپ باہر سے لا رہے تھے؟ یہ بھی بتا دیں کہ وہ سستے 50 لاکھ مکان کہاں گئے؟ وہ ایک کروڑ نوکریاں کہاں گئیں؟ وہ پانی دینے کا وعدہ کہاں گیا؟ ڈیم بنانے کی باتیں بھی یاد ہیں یا نہیں؟ چلیں ان سب کو بھی تھوڑی دیر کے لیے ایک سائڈ پر رکھ دیتے ہیں، کم از کم یہ ہی بتا دیں کہ ایک غریب کا چولہا 15، 20 ہزار میں کیسے چل سکتا ہے؟ ان پڑھ شخص کے لیے گورنمنٹ کے پاس کیا پالیسی ہے؟ اسے کس طرح کا روزگار ملے گا؟ کیا مدینے کی ریاست میں ایک مڈل پاس کو 50 ہزار روپے کی نوکری مل سکتی ہے؟ کیا مدینے کی ریاست میں کسی بیوہ کی ماہانہ کفالت کا بندوبست بھی ہے یا نہیں؟ اگر آپ یہ کہیں گے کہ اس کے لیے بیت المال ہے تو پھر صرف یہ ہی کہا جا سکتا ہے افسوس آپ اپنے سرکاری ملازمین کی رشوت خوری سے واقف نہیں ۔یا پھر ان کی بے ایمانی آپ کو نظر نہیں آتی ۔بے نظیر انکم سپورٹ پروگرام کے کارڈ بھی صاحب حیثیت لوگوں کے پاس ہی دیکھے گئے ہیں۔

وزیر اعظم صاحب آخر میں صرف اتنا ہی کہنا چاہوں گا کہ غریب سے جینے کا حق مت چھینیں ۔غریب کی آہ میں بہت اثر ہوتا ہے اور اگر یقین نہ آئے تو پھر خاتون اول سے ہی پوچھ لیجیے گا شاید آپ کو معلوم ہو جائے ۔ورنہ آپ کے ساتھ اور

آپ کے نیچے کام کرنے والوں کو اس کا ذرا بھی احساس نہیں۔ اگر ہوتا تو کم از کم ملک میں غریب کے لیے بھی کوئی قانون ضرور ہوتا۔ یاد رکھیے گا آپ اسلامی ملک کے سربراہ ہیں اور خدا کی قسم اسلامی ملک کا سربراہ رعایا کی ذمے داریوں سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔

30 برس پرانا کراچی

کراچی دنیا کے بڑے شہروں میں شمار ہونے والا ایک شہر ہے جس کی آبادی ایک اندازے کے مطابق 2 کروڑ یا اس سے زیادہ شمار کی جاتی ہے ۔ کلاچی سے کراچی بنتے بنتے اس شہر نے کئی نشیب و فراز دیکھے ۔ لیکن اس شہر کی بدقسمتی ہی رہی ہے کہ آج بھی اسے ان گنت مسائل کا سامنا ہے' عوام کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانے کے لیے پہلے زمانے میں ٹراما اور بیل گاڑیوں کا استعمال کیا جاتا تھا' لیکن آج جدید دور میں آنے کے باوجود بھی کراچی کو ٹرانسپورٹ کا کوئی نظام میسر نہیں ۔ کئی حکومتیں آئیں اور گئیں مگر سلسلہ جوں کا توں ہی ہے جیسا کہ آج سے پہلے چل رہا تھا ۔ 2 کروڑ آبادی والے اس شہر کو پرائیوٹ کوچ مالکان کے رحم و کرم پر چھوڑا ہوا ہے جن کا کوئی پرسان حال نہیں ۔ صبح گھر سے دفتر کے لیے نکلنے والا شخص روزانہ کم از کم 4 سے 6 گھنٹے اس پرائیوٹ کوچز میں گزارتا ہے ۔ اس شہر میں نہ تو ہر شخص کے پاس موٹر سائیکل ہے اور نہ موٹر کار' اور جن کے پاس موٹر سائیکل یا موٹر کار ہے وہ بھی بدترین ٹریفک میں کم از کم روزانہ 2 سے 4 گھنٹے سڑکوں پر گزارتے ہیں ۔ پرائیوٹ پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے والے ہر روز بدتمیز ڈرائیوروں اور کنڈیکٹروں کے ہاتھوں الگ ذلیل ہو رہے ہیں ۔ لیکن انہیں پوچھنے والا بھی اس شہر میں کوئی نہیں ۔ نہ ہی ہماری ٹریفک پولیس میں اتنی جرات ہے کہ وہ ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر سکے ۔ یہ لوگ اتنے طاقت ور ہیں کہ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں ۔ کرائیوں میں اضافہ بھی ان کی مرضی کا ہی ہوتا ہے اور جس میں ان کی مرضی شامل نہ ہو تو وہ زبردستی عوام سے من مانی کر کے اپنا ڈبل منافع وصول کر لیتے ہیں ۔ بغیر لائسنس کے گاڑی چلانے والے ان ڈرائیوروں کو معلوم ہے کہ روزانہ 200 روپے ان ٹریفک پولیس والوں کو دے کر اپنا کام چلایا جا سکتا ہے اور جن کے پاس لائسنس ہے انہیں بھی معلوم ہے کہ کسی بھی غلطی کا ازالہ صرف 200 روپے میں کیا جا سکتا ہے ۔

کراچی کو ایک با اختیار میئر کی ضرورت ہے مگر شاید اس کی قسمت میں ایسا کبھی نہ ہو ۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک اس شہر میں کوئی بھی کام سیدھے طریقے سے نہیں ہوا ۔ ہر کام میں رکاوٹ' ہر کام میں بدانتظامی' ہر کام میں رشوت خوری جیسے عوامل شامل ہی رہتے ہیں ۔ مفاہمت کی سیاست نے جہاں ملک کو اور قوم کو نقصان پہنچایا ہے وہیں کراچی کو بھی بدترین مسائل

کی آماجگاہ بنادیا گیا ہے۔سیاست میں کراچی سمیت پورے سندھ کو ٹرپ کے پتے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔جو ادارے شہری حکومت کے پاس ہونے چاہیں وہ صوبائی حکومت نے اپنی بغل میں دبائے ہوئے ہیں۔اور صوبائی ارکان جنھیں صرف اپنی سیکورٹی کی پرواہ رہتی ہے انہیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ شہر میں کیا ہو رہا ہے اور شہری کن کن مسائل کا سامنا کر رہے ہیں۔

کراچی کے بڑے مسائل میں جہاں ٹرانسپورٹ،پانی،گندگی،تجاوزات شامل ہے وہیں سب سے بڑا مسئلہ آلودگی بھی ہے جس پر ماہرین چیخ چیخ کر ہلکان ہو رہے ہیں مگر متعلقہ ادارے تا حال سکون کی بانسری بجا رہے ہیں۔13 نومبر 2018 کو عالمی انڈیکس اے کیو آئی نے ایک رپورٹ جاری کی تھی جس میں اس وقت کراچی کی فضائی آلودگی کو انتہائی خطرناک درجے پر پایا گیا،رپورٹ میں بتایا گیا کہ کراچی کی فضا میں آلودگی 331 درجے تک پہنچ چکی ہے جو انتہائی خطرناک صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔درجہ بندی کے مطابق 151 سے 200 درجے تک آلودگی مضرِ صحت ہوتی ہے جب کہ 201 سے 300 درجے تک انتہائی مضر صحت اور 301 سے زائد درجہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔انڈیکس کے مطابق اس وقت کراچی میں یہ 331 درجے ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ کراچی میں فضائی آلودگی خطرناک زون میں داخل ہو چکی ہے۔

گرین کراچی کے نام پر ہمیشہ کروڑوں روپے ہڑپ کیے گئے،مگر اس پر کہیں بھی کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی،اور اگر کہیں آواز اٹھائی بھی گئی تو اس پر نہ تو کوئی ایکشن لیا گیا اور نہ ہی کوئی کارروائی کی گئی شجرکاری مہم ہر سال بڑے زور وشور سے شروع کی جاتی ہے لیکن آج تک اس کا کوئی سر پیر نظر نہیں آیا اور نہ یہ نظر آیا کہ جہاں شجرکاری مہم شروع کی گئی تھی وہاں ایک سال بعد پودوں اور درختوں کی کیا صورت حال ہے،اور نہ اس پر اب تک کوئی رپورٹ پیش کی گئی۔2017 میں گرین لائن بس سروس روٹ پر آنے والے درختوں کی کٹائی پر وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے انتہائی برہمی کا اظہار کیا تھا اور ایک اعلیٰ سطحی اجلاس میں متعلقہ حکام سے اس پر فوری رپورٹ طلب کر کے ہدایت جاری کی کہ جتنے درخت کاٹے گئے ہیں اس سے 200 گنا درخت اضافی لگائے جائیں،جو کم وبیش 2 کروڑ درخت بنتے تھے۔لیکن اس رپورٹ اور ہدایت کا بھی کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا اور آج وہاں درخت تو درکنار کہیں ایک پودا بھی نہیں لگایا گیا۔

فضائی آلودگی کے معاملے پر جو ہوا سو ہوا،لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آبی آلودگی پر بھی اب تک کوئی کام نہیں کیا گیا،جہاں منافع خوروں نے درختوں کو کاٹ کر عیش وعشرت کا ساماں بنا کر شہر کو آلودہ کر دیا وہیں ساحلوں پر آباد ماہی گیروں نے مینگروز کو کاٹ کر آبی حیات کے خاتمے کے ساتھ ساتھ زلزلوں اور طوفانوں کا ساماں پیدا کر دیا۔جس طرح درخت ہمارے لیے ایک نعمت سے کم نہیں وہیں آبی حیات کی بقا کے لیے مینگروز بھی کسی رحمت سے کم نہیں۔

بوٹ بیسن بے نظیر بھٹو شہید پارک کی تعمیر کے بعد وہاں پر سمندری راستے کو بند کر کے آبی حیات پر پہلا بے رحمانہ اقدام کیا گیا جس کے بعد آج پارک تو محض چند سوفٹ پر ہی رہ گیا ہے باقی چائنا فیسٹیول اور دیگر پارٹیز کے نام منسوب

کر کے پارک کے آدھے سے زائد حصے کو آمدن کا حصہ بنا لیا گیا ہے۔سونے پر سہاگہ یہ کہ پارک کے ساتھ سمندر کے راستے کو بند کرنے کے بعد اب وہاں پر صفائی کا کام جاری ہے جس کے بعد اس حصے کو مٹی سے بھر کر زمین ہموار کر دی جائے گی۔بینظیر بھٹو شہید پارک کے سامنے روڈ پار ہجرت کالونی کے پیچھے والا حصہ ہے جہاں ہجرت کالونی سمیت آس پاس کی دیگر آبادیوں کا سیوریج کا پانی بنا کسی روک ٹوک کے سمندر کی نظر کر کے آبی حیات کو مکمل ختم کر دیا گیا ہے۔

چیف جسٹس آف پاکستان نے جہاں تجاوزات کے خلاف ایکشن لیا ہے وہیں اس شہر کی ایک فریاد یہ بھی ہے کہ اگر 30 سال پہلے والا کراچی چاہیے تو 30 سال پہلے والا ماحول بھی اس شہر کو دیا جائے، ورنہ 30 سال پہلے والے کراچی کو واپس لانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

زینب! ہم شرمندہ ہیں

میڈیا کے ذریعے ایک دل دہلانے والی خبر سن کر پہلے تو یقین نہیں آیا، لیکن جب تمام نیوز چینلز نے اس خبر کو بریک کرنا شروع کیا تو آنکھوں سے بے تحاشہ آنسو جاری ہو گئے۔ ایک طرف زینب کا چہرہ تو دوسری طرف اپنی بیٹی سکینہ کا چہرہ نظر آنے لگ گیا، ایک باپ ہونے کے ناطے میں اس غم کو سمجھ سکتا ہوں لیکن نہ تو اسے لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں اور نہ زبان سے ادا کر سکتا ہوں۔ یہ کسی سانحے سے کم نہیں، شاید یہ ہی وجہ ہے کہ وطن عزیز میں سانحات بھی آئے روز کا معمول بنتے جا رہے ہیں۔ اس سانحے پر لکھنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں، کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا لکھوں، حکمرانوں کا سیاسی کھیل لکھوں، معاشرے کی بے حسی لکھوں، انصاف کا بکنا لکھوں یا محافظوں کا لٹیرا بن جانا لکھوں۔؟

اس مردہ معاشرے کی چند جھلکیاں بتا رہا ہوں جو آئے روز ہمیں دیکھنے اور سننے کو ملتے ہیں، اگر کسی محلے میں کسی بہن بیٹی کو کوئی دو کوڑی کا غنڈہ چھیڑتا ہے تو محلے والے اسے کچھ کہنے کے بجائے اس بہن بیٹی پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دیتے ہیں کہ اس کا کریکٹر صحیح نہیں ہے اس لیے تو اس غنڈے نے اسے چھیڑا ہے۔ اگر کوئی لڑکی غنڈے سے مڈ بھیڑ کر لے تو کچھ شریف زادے آ کر اس لڑکی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں آپ اس راستے سے مت آیا کریں، ان سے مت الجھا کریں، یہ لوگ ٹھیک نہیں کہہ کر اس غنڈے کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں، اور اسے پوری چھوٹ دے دیتے ہیں کہ وہ اپنی بے غیرتی والا کام پوری ایمانداری سے کرے۔ اسی طرح اگر یہی صورت حال کبھی ان کی بہن بیٹی سے پیش آ جائے تو پھر وہ اپنی بہن بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کرنے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں، دونوں صورتوں میں اس معمولی اور دو کوڑی کے غنڈے کو کچھ نہیں کہا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ اتنا پاورفل ہو جاتا ہے کہ وہ قانون تک کو خریدنے کی طاقت پا لیتا ہے اور ہم پھر اس کی غلامی میں جت جاتے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے مسئلے کے لیے اس کے آگے سربسجود ہوتے نظر آتے ہیں۔

زینب کا واقعہ کوئی پہلا سانحہ نہیں ہے، اس سے پہلے بھی کئی ایسے واقعات ہو چکے ہیں جن پر نہ زمین پھٹی نہ آسمان گرا، کیوں کہ اللہ پاک نے قرآن پاک میں صاف صاف فرما دیا ہے جیسے اعمال ہوں گے ویسے حکمران مسلط کیے جائیں گے۔ سابق وزیر اعظم میاں نواز شریف صاحب کا بیان بھی آج آنکھوں کے سامنے سے گزرا جس میں وہ کہتے ہیں کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاکستان میں انصاف اتنا مہنگا ہے، وکیلوں کی فیسیں دے دے کر تھک چکا ہوں، یہ بات ایک ایسا شخص کر رہا ہے جو خود کو عوامی نمائندہ کہتا ہے، جس نے تین بار وزیر اعظم کا معتبر عہدہ سنبھالا، وزیر اعلیٰ کے منصب پر فائز

ہوا، وہ شخص ایسی باتیں کر رہا ہے۔؟ شاید درست ہی کہہ رہا ہے جب اپنی پر آتی ہے تو پھر سب کچھ یاد آتا ہے، تین مرتبہ وزیر اعظم بننے والے کو اب جا کر معلوم ہوا کہ پاکستان میں انصاف مہنگا ہے۔ وکیلوں کی فیسیں مہنگی ہیں۔ مگر انہیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا کہ ملک میں تعلیم بھی بہت مہنگی ہے، ملک میں ادویات بھی بہت مہنگی ہیں، ملک میں دو وقت کی روٹی کمانا بھی بہت مہنگا ہے۔ غریب کی بیٹی کی شادیاں بھی نہیں ہو رہی ہیں کیوں کہ جہیز بھی بہت مہنگا ہو گیا ہے۔ صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ انصاف مہنگا ہے کیوں کہ وہ اب اس چکر میں بری طرح پھنس چکے ہیں اس لیے اس بات کا اندازہ انہیں اب ہوا ہے۔ مگر عوام جو پچھلے ستر سالوں سے چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے کہ ہم پر رحم کیا جائے اس کی پکار اب تک کسی نے نہیں سنی۔

زینب کے قتل کا ذمے دار صرف معاشرہ ہی نہیں بلکہ ہر وہ شخص ہے جو انصاف کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا، ہر وہ شخص جو تعلیم کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے، ہر وہ شخص جو روزگار کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے، ہر وہ شخص جو عوامی اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود عوام کے لیے کچھ نہیں کرتا وہ سب اس کے ذمے دار ہیں۔ عوامی نمائندے اپنے مطلب کے لیے راتوں رات قانون میں تبدیلیاں کر دیتے ہیں، مگر عوام کے لیے ایک بل بھی کئی کئی سالوں تک دفاتر وں کی دھول میں اٹایا جاتا ہے۔ سندھ میں پیپلز پارٹی کو کچھ کہہ دو تو اگلے دن اسمبلی میں اس پر مذمتی قرار داد پاس ہو جاتی ہے، پنجاب میں خادم اعلیٰ کو کچھ کہہ دو تو لمبا چوڑا بیان حکومتی مشینری کی طرف سے آجاتا ہے، وزیر اعظم کو کچھ کہہ دو تو قومی اسمبلی میں تہلکہ مچ جاتا ہے۔ مگر عوام کو کچھ بھی ہو جائے ایک قرار داد تو دور کی بات اس پر بات تک کرنے کا وقت نہیں دیا جاتا ہے۔

نواز شریف کو پارٹی کا صدر منتخب کرنے کے لیے فوری طور پر بل پاس کروا کر چند دنوں میں اسے قانون کا حصہ بنا دیا گیا لیکن عوام کے بنیادی مسائل کے لیے کوئی ایک بل تک اسمبلیوں کی سڑھیوں تک بھی نہیں پہنچایا جاتا۔

زینب ہو، طیبہ ہو طوبا ہو یا پھر عمران ہو، از خود نوٹس لیے جائیں گے، قاتل بھاری فیسیں دے کر یا تو ضمانتیں کروالیں گے یا پھر کچھ عرصے بعد با عزت بری ہو جائیں گے۔ سانحات ہوتے رہتے ہیں اور ہم بھولتے رہتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف اور صرف یہ ہے کہ پاکستان میں قانون بکتا ہے۔ اگر قانون سخت ہوتا تو کسی میں کیا مجال تھی وہ ایسی گھٹیا پن اور درندگی کا مظاہرہ کرتا۔ قانون ساز اداروں کے کرتا دھرتا اپنے مطلب کی ترامیم کے لیے ہر وقت تیار بیٹھے رہتے ہیں، مگر عوام کے لیے ان کے پاس وقت نہیں۔ اگر زینب کسی صاحب منصب کی بیٹی ہوتی تو شاید راتوں رات قاتل بھی پکڑ لیے جاتے اور اگلے دن قانون میں ترمیم کر کے ایسے مجرم کو سرے عام پھانسی پر لٹکانے کا بل بھی پاس ہو جاتا، مگر زینب غریب کی بیٹی تھی اس لیے ہمیں کسی بھی قسم کی توقع نہیں کرنی چاہیے کہ قاتل اس کھوکھلے قانون کی گرفت میں آئے گا، اور اگر کسی طور آ بھی گیا تو کم از کم ہمارے جیتے جی تو اسے سزا نہیں ملنے والی، صرف سماعت پر سماعت ہوگی، انکوائریاں ہوں گی، کیس چلتا رہے گا اور قانون بکتا رہے گا۔

آخر میں صرف اتنا ہی کہوں گا کہ اگر زینب جیسے سانحے کی روک تھام نہ کی گئی تو کل کو یہ حادثے غریب کی جھونپڑی سے

نکل کر امیر کے محلوں تک پہنچنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔پھر اس وقت کی جانے والی قانون سازیاں کسی کام کی نہیں رہیں گی۔اب بھی وقت ہے قانون کو مضبوط کیا جائے،فوری انصاف کی راہ ہموار کی جائے اور سفارشیوں اور کرپٹ لوگوں کو نوکریوں سے برخاست کیا جائے تاکہ کل کو کوئی اور زینب کسی اور درندے کی حیوانیت کا نشانہ نہ بنے۔ورنہ بقول راحت اندوری کے۔

لگے گی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا ہی مکان تھوڑی ہے

پولیو اور سوشل میڈیا کا غلط استعمال

سوشل میڈیا/الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کی موجودہ دور میں اہمیت وافادیت سے ہر شخص واقف ہے۔ایک وقت تھا جب اخبار کی چھپائی اور اس کی لوگوں تک رسائی ایک انتہائی مشکل مرحلہ ہوا کرتا تھا۔تاہم جیسے جیسے وقت گزرتا گیا ویسے ویسے اس میں جدت آتی گئی اور آج صورت حال یہ ہے کہ ایک بٹن دبائیں اور اپنی بات پوری دنیا تک پہنچا دیں۔پرنٹ میڈیا کی ترقی کے بعد الیکٹرانک میڈیا کا دور آیا اور اس نے بھی کم ہی عرصے میں لوگوں کے دلوں میں اپنی جگہ بنالی۔جب الیکٹرانک میڈیا کو اپنی طاقت کا اندازہ ہوا تو اس نے کہیں کہیں اپنے مفادات کی خاطر اس کا غلط استعمال بھی شروع کردیا۔جس کی دیکھا دیکھی میں ایک اور انقلابی دور آیا جس میں سوشل میڈیا نے نہ صرف پرنٹ میڈیا کو پیچھے چھوڑ دیا بلکہ الیکٹرانک میڈیا کو بھی اپنا محتاج بنالیا۔سوشل میڈیا الیکٹرانک میڈیا کے غلط استعمال کے باعث وجود میں آیا تاہم اب یہی سوشل میڈیا ہر اچھے اور برے لوگوں کی پہنچ میں ہے،جو ہر غلط کام کو صحیح کرکے دنیا کو دکھانے پر تلے ہوئے ہیں اور اس آڑ میں اپنے مذموم مقاصد کو بھی حاصل کررہے ہیں۔

ذرائع ابلاغ کے کچھ اصول ہیں جیسا کہ اخبارات اور الیکٹرانک میڈیا میں کسی بھی خبر کی تشہیر سے قبل اسے کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جس میں پہلے خبر دینے والا کا قد کاٹھ دیکھا جاتا،پھر ایڈیٹر اس خبر کی اہمیت پر نیوز ایڈیٹر سے مشورہ کرتا تھا جس کے بعد اس کی تشہیر کا فیصلہ کیا جاتا تھا،ذرائع ابلاغ کے اداروں میں آج بھی ایک ایڈیٹوریل بورڈ اس کام پر مامور ہے۔تاہم سوشل میڈیا میں اس کے حوالے سے کوئی اصول نہیں۔جس کا جو دل چاہا اس نے لکھ دیا اور شیئر کرکے اپنے مقاصد کو حاصل کرلیا۔

آج جہاں سوشل میڈیا بے نامی اور من گھڑت خبروں کا گڑھ بنا ہوا ہے وہیں یہ سوشل میڈیا کئی حقیقت اور سچائی پر مبنی خبروں کی عکاسی بھی کرتا دکھائی دیتا ہے۔لیکن بات پھر وہیں آجاتی ہے کہ اس میں کوئی چیک اینڈ بیلنس موجود نہیں۔

اس میں نہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ خبر دینے والا کون ہے اور نہ کسی کو یہ معلوم ہے کہ اس خبر سے اس کی یا کسی اور کی زندگی یا پھر ملک کے امیج پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔بس جو دل میں آیا لکھا اور شیئر کردیا،جس سے معاشرے میں بہت سا بگاڑ

سامنے آرہا ہے۔
میں جس مسئلے پر سوشل میڈیا صارفین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں وہ ایک انتہائی نازک معاملہ ہے۔چند روز سے سوشل میڈیا پر ایک خبر زیر گردش ہے کہ پولیو کے قطروں اور حفاظتی ٹیکوں سے بچوں کی جان جارہی ہے۔لہٰذا شہری پولیو کے قطرے پلانے والوں سے بالکل تعاون نہ کریں اور انہیں اپنے بچوں کو قطرے نہ پلانے دیں۔ساتھ ہی حفاظتی ٹیکوں سے متعلق بھی یہ ہی من گھڑت کہانیاں بنا کر سوشل میڈیا پر پھیلائی جارہی ہیں' جس کا یہ ردعمل نکلا ہے کہ اب گھر گھر جانے والی پولیو ٹیم سے بہت کم لوگ تعاون کررہے ہیں اور اپنے بچوں کو قطرے پلانے سے انکاری ہیں اُن تمام خاندانوں کا ایک ہی جواب سامنے آتا ہے کہ فیس بک پر ویڈیو میں دیکھا ہے کہ پولیو کے قطرے پینے سے بچے مر رہے ہیں اور حفاظتی ٹیکوں سے بچوں میں بیماریاں پھیل رہی ہیں۔یہ سب باتیں اور ویڈیوز من گھڑت اور ایک سازش کے تحت پھیلائی جارہی ہیں ان لوگوں کو مقصد صرف یہ ہے کہ پاکستان سے پولیو ختم نہ ہو اور پاکستان میں بچے موذی امراض سے مرتے رہیں۔
پاکستان میں 2010 میں پولیو کے 144 کیس سامنے آئے۔جس کے بعد متعلقہ اداروں اور پولیو ورکرز کی انتھک محنت کے بعد 2017 میں اس کی تعداد گھٹ کر صرف 8 رہ گئی ہے' 2017 میں پنجاب میں ایک کیس' سندھ میں 2' خیبر پختونخوا 1' بلوچستان 3 اور گلگت بلتستان میں ایک کیس سامنے آیا۔جب کہ فاٹا اور آزاد کشمیر میں 2017ء ؁ پولیو ورکرز کی انتھک محنت کے بعد کوئی کیس سامنے نہیں آیا اور یہ سب عوام کے تعاون سے ممکن ہوا۔
پولیو کے حوالے سے دنیا کے جید اور ممتاز عالم دین کے فتوؤں کے باوجود آج بھی کئی گھرانے ایسے ہیں جو اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے انکاری ہیں۔ان کی اس طرح ذہن سازی کی گئی ہے کہ وہ اسے نسل کشی کی دوا سمجھ بیٹھے ہیں اور یہ سب سوشل میڈیا کے ذریعے ہوا ہے۔اس میں کسی حد تک قصور الیکٹرانک میڈیا اور سائبر کرائم ڈپارٹمنٹ کا بھی ہے جو ایسی من گھڑت خبروں کو نوٹس میں نہیں لاتا اور نہ ہی اس حوالے سے عوام میں شعور فراہم کرتا ہے۔بھارت ہم سے آبادی میں کئی گنا بڑا ملک ہے اور وہاں 2011ء ؁ سے اب تک کوئی پولیو کیس سامنے نہیں آیا جس کے بعد اسے پولیو فری ممالک میں شامل کردیا گیا ہے۔اس وقت دنیا میں صرف 3 ممالک ایسے ہیں جہاں یہ موذی بیماری موجود ہے جس میں نائجیریا' افغانستان اور پاکستان شامل ہے۔پاکستان میں پولیو کا خاتمہ نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ افغانستان سے آنے والے مہاجرین بھی ہیں جو اپنے بچوں کو پولیو کے قطرے پلانے سے گریز کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے آج تک پاکستان اس موذی بیماری سے پاک نہیں ہوسکا۔
پولیو ایک خطرناک وائرس ہے جو ایک بار اس کا شکار ہوجاتا ہے وہ ساری زندگی کے لیے اپاہج ہوجاتا ہے۔ہم اپنی کم عقلی اور پروپیگنڈے کے سامنے سر خم کرلیتے ہیں مگر اس کا نقصان ہماری آنے والی نسلوں کو ہوگا جس کا ہمیں آج بالکل بھی اندازہ نہیں۔حکومتی ادارے دوست ممالک کے تعاون سے جہاں اس موذی بیماری کے خاتمے کے لیے کوشاں ہے

وہیں معاشرے کے کچھ ناسور اس مہم کو ہمیشہ ناکام بنانے پر تلے نظر آتے ہیں ہمیں ان کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔ کیوں کہ اگر یہ پولیو ویکسین نسل کشی یا پھر بچوں کی اموات کا سبب بن رہی ہوتی تو اس وقت ملک میں صرف انہیں کے بچے زندہ ہوتے جنھوں نے پولیو ویکسین اپنے بچوں کو نہیں پلائی۔ اور اگر یہ ویکسین نسل کشی کا سبب بن رہی ہوتی تو آج پاکستان میں آبادی جس تیزی سے پھیل رہی ہے وہ اس طرح نہ پھیلتی۔

میری سوشل میڈیا صارفین سے گزارش ہے کہ وہ ایسی خبروں' تصاویر اور ویڈیوز کو شیئر کرنے سے پہلے اس کی تصدیق کر لیں اور اگر آپ اس کی استطاعت نہیں رکھتے تو پھر کم از کم ایسی من گھڑت خبروں کو پھیلانے کا باعث بھی نہ بنیں۔

میری حکومت اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بھی یہی گزارش ہے کہ وہ ایسی من گھڑت خبروں کا فوری نوٹس لے کر سازشی عناصر کے خلاف بھرپور کارروائی کا آغاز کریں تا کہ پاکستان جلد سے جلد پولیو جیسے مرض سے پاک ہو جائے۔

نیا سال اور نئی نسل

اٹھارہ سو سینتالیس میں انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کیا اور پھر سو سال تک انہوں نے اس سرزمین پر حکومت کی، اس سے قبل مغل اور میروں کی حکومت رہی، ان کی حکومت کا دورانیہ انگریزوں کی حکومت سے زیادہ رہا، اسی طرح عربوں نے اس سرزمین پر اپنا حکم چلایا، لیکن جو سبق ہمیں سو سال میں انگریزوں نے پڑھایا وہ ہمیں اب بھی یاد ہے اور شاید رہتی دنیا تک یاد بھی رہے۔ تاہم مغل، میروں اور عربوں کی حکومت میں جو تہذیب، رواج اور تہوار تھے اسے ہم آج دقیانوسی مانتے ہوئے کب کے بھلائے بیٹھے ہیں، لیکن اس کے برعکس انگریزوں کا سبق ہمیں ہر دور میں نیا ہی لگتا ہے۔ چند لاکھ انگریز ہماری پوری تہذیب و تمدن کو بدل کر چل دیے، ہم لاکھوں بلکہ کروڑوں ہونے کے باوجود انہیں اپنے رنگ میں نہ رنگ سکے اور یہ ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے۔

پاکستان سمیت دنیا بھر میں نئے سال کا استقبال آتش بازی کر کے کیا جاتا ہے، جس پر اربوں ڈالر پھونک دیے جاتے ہیں، اسی طرح پاکستان میں بھی صورت حال کچھ زیادہ مختلف نہیں، یہاں بھی کروڑوں روپے نئے سال کی آمد پر صرف آتش بازی اور دیگر خرافات میں جھونک دیے جاتے ہیں، ہوائی فائرنگ، لڑائی جھگڑا، شراب و شاداب کی محفلیں اور بہت سی دیگر غیر ضروری اور غیر اسلامی رواجوں کے ذریعے جہاں ایک طرف پیسوں کی تباہی کا سامان پیدا کرتے ہیں دوسری طرف قیمتی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا ملک ضرور ہے مگر ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں ہم دنیا کے دسویں نمبر پر بھی نہیں آتے۔ جس کا ملک کا بچہ بچہ ایک لاکھ چھبیس ہزار روپے کا مقروض ہو اس ملک کے حکمرانوں اور عوام کو اپنا ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاہم یہاں صورت حال اس کے برعکس ہے۔

اخباری رپورٹوں کے مطابق گزشتہ سال نئے سال کی آمد کی خوشی میں ہوائی فائرنگ کے نتیجے میں قریبا سو افراد جان سے گئے اسی طرح زخمی ہونے والوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ ہے۔ شہر ہو یا گاؤں اب یہ رواج اتنا زور پکڑ گیا ہے کہ عید کا چاند ہو یا جشن آزادی، نیا سال ہو یا پھر کسی رئیس زادے کی شادی، ہوائی فائرنگ اور آتش بازی کے استعمال کے بغیر اب ادھوری سمجھی جانے لگی ہے۔ آج کا پاکستانی ویسے تو امریکا کو کوستے نہیں تھکتا، ملک کے ہر کام کے بگاڑ کے پیچھے ہم انہیں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں لیکن دوسری طرف ہم ان کی خرافات کو خوشی بخوشی قبول بھی کرتے رہتے ہیں۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے بیت المقدس کے حوالے سے دیے گئے بیان پر پوری امت مسلمہ شدید غم و غصے میں ہے مگر دوسری طرف یہ

ہی امت مسلمہ ہے جو انگریزوں کے رسم ورواج کے بغیر خود کو ادھورا سمجھتے ہیں، ان کے لباس سے لے کر ان کی اسلام دشمن پالیسیوں میں ہر وقت لبیک لبیک کرتے رہتے ہیں، ایک طرف او آئی سی امریکا کی مخالفت کرتا ہے تو دوسری طرف سعودیہ عرب امریکا سے اپنی دوستی مضبوط کرنے کی ہر ممکن کوششوں میں مصروف نظر آتا ہے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں؟۔

عموماً اعلیٰ ایوانوں سے آواز آتی ہے کہ ملک کو اسلحے سے پاک کریں گے، اسٹینڈنگ کمیٹی بھی اس پر توجہ دے رہی ہے مگر سوال یہ اٹھتا ہے کہ آخر یہ غیر قانونی اسلحہ ملک میں آیا کیسے، ہماری تمام تر توجہ شہروں سے غیر قانونی اسلحے کو نکالنے میں لگی ہوئی ہے تو دوسری جانب اس سے کہیں زیادہ غیر قانونی اسلحہ ملک میں آ بھی رہا ہے۔ ان کے خلاف کیا اقدامات کیے جا رہے ہیں اس پر کوئی کچھ کہنے کو تیار نہیں۔

آج ملک کا بچہ بچہ بڑوں سے بغاوت پر اترا ہوا ہے، اگر کوئی سمجھانے کے لیے کوئی بات کہہ دے تو نتیجہ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نکلتا ہے۔ معاشرہ بے راہ روی کی طرف تیزی سے گامزن ہے اور ہم آج بھی اپنی عیاشیوں میں لگے ہوئے ہیں۔ انگریز ہمیں کبھی ترقی کرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا اس لیے وہ ہمیں مصروف رکھنے کے لیے کئی محاذ پر کام کر رہا ہے کبھی وہ ہمیں نام نہاد دہشت گردی کی جنگ میں جھونک دیتا ہے تو کبھی ہمارے مذہب پر وار کرتا ہے، لیکن ہم اس چیز کو سمجھنے سے بلکل قاصر ہو چکے ہیں۔ آج تک ہمارے کسی بھی بیان پر امریکی یورپی عوام نے کوئی ردعمل نہیں دیا، یہاں تک کہ ان کی حکومتیں بھی ہماری کسی بات کو سیریز نہیں لیتی، لیکن ہم ان کے سر درد کو بھی اپنا مسئلہ بنا کر اس پر الجھنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اب ہمیں ان تمام سازشوں اور عوامل سے باہر نکل کر اپنے عوام اور اپنے ملک کے لیے بھی سوچنا ہوگا، اپنے نوجوان اور آنے والی نسلوں پر بھی توجہ دینا ہوگی، انہیں معاشرے کا کارآمد شہری بنانے کے لیے پر محنت کرنے کی ضرورت ہے اور اگر ہم نے اس پر کوئی منصوبہ بندی نہ کی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم معیشت اور پیک کو لے کر بیٹھے رہیں اور ہماری نوجوان نسل کسی اور راستے پر چل کر کل ہمارے سامنے دشمن کے طور پر کھڑی ہو جائے۔ ہمیں ان خرافاتوں سے نکلنا ہوگا، ہمیں ان سازشوں کو سمجھنا ہوگا، کیوں کہ ہم پاکستان سے ہیں اور پاکستان ہم سے ہے۔

تمت بالخیر